الف تحاشا

نریندر لوتھر

سلسلۂ مطبوعات زندہ دلانِ حیدرآباد

○ خوشنویس : محمود سلیم

○ سنہ اشاعت : ۱۹۸۵ء

○ تعداد : ایک ہزار

○ قیمت : سولہ روپے (۱۶ روپے)

○ ناشر :

زندہ دلانِ حیدرآباد

۲۷ - بیچلرز کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱

○ طباعت

گولڈن پریس ۔ حیدوآباد

ب تحاشا

یہ میری اُردو کی تیسری کتاب ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے میں نے صرف دو کتابیں پڑھی ہیں یا یہ کہ میں مدرسوں کے لیے نصابی کتابیں لکھتا ہوں اور یہ تیسری جماعت کے لیے لکھی گئی ہے یا پھر یہ کہ اسے محکمۂ تعلیم سکولوں کی تیسری جماعت کے لیے "لگا" دے گا۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اُردو زبان میں میں اس سے پہلے دو کتابیں لکھ چکا ہوں۔ "بند کواڑ" اور "مزاج پرسی"۔ اور یہ دونوں کتابیں اب نایاب ہیں۔ جس کسی کے پاس ان کتابوں کا کوئی نسخہ ہو وہ اُسے سنبھال کر رکھے۔ ایک دن جب یہ نادر کتبی ہوجائیں گی، اُن سے بہت پیسہ کمایا جا سکتا ہے۔ اگر کسی کو اس بات پہ شک ہو تو میں بذاتِ خود فی نسخہ دُگنی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں! خیر، یہ تیسری کتاب ہے اور نام ہے "الف تحاشا"۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ عجیب سا نام ہے لیکن اس کا 'الف ننگے' سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کتاب کی اشاعت میں اتنی تاخیر ہونے کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ کتاب کے لیے کوئی مناسب نام نہیں مل رہا تھا۔ طنز و مزاح کے مجموعے

لیے ہر قسم کے نام "بہر حال" سے "ٹائیں ٹائیں فِش" تک مختلف مزاح نگار استعمال کر چکے تھے۔ دوست احباب عجیب عجیب، ثقیل اور سنجیدہ قسم کے نام تجویز کر رہے تھے۔ ایک دو خیر خواہوں نے تو بہت ہی بے ہودہ نام بھی تجویز کئے۔ اُن کا خیال تھا کہ ایسے نام والی کتابیں زیادہ بکتی ہیں۔ یہ بکری والی بات اُردو کتابوں کے تعلق سے کچھ بے تُکی سی لگتی ہے۔ خیر، اس کمرشیل قسم کی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات ہم کسی سمینار کے لیے اُٹھا رکھیں گے۔ اگر ادیب خود ہی اپنی تخلیق کی بے ہودگی کا ڈھنڈورا پیٹے تو تنقید نگار بے چارے کیا کریں گے اور دوستوں کے لیے کیا بات رہ جائے گی؟ مدیرِ "شگوفہ" ڈاکٹر مصطفٰے کمال نے جو اُردو کے لیکچرر بھی ہیں کئی نام تجویز کئے لیکن ان کے لیے مجھے بھی فارسی کی لُغات دیکھنی پڑی۔

آخر ایک سُہانی شام کو ہم نے فیصلہ کر ہی ڈالا (فیصلہ کرنے والی ساعتیں، انگریزی میں ہمیشہ سہانی صبح اور اُردو میں سُہانی شام کو نازل ہوتی ہیں) فیصلہ ہوا کہ نام 'بے تحاشا' مناسب رہے گا کہ یہ انگریزی لفظ SPONTANEOUS کا بہتر متبادل ہے۔ اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیشتر مضامین بے تحاشا ہی وارد ہوئے تھے۔ پھر خیال آیا کہ حرف 'ب' کا تلفظ 'بے' ہوتا ہے، تو پھر 'ے' لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ نہ صرف دھن دولت بلکہ الفاظ میں بھی کفایت شعاری بہت ضروری ہے۔ پھر یہ خیال آیا کہ ابجدی ترتیب میں حرف "ب" سے پہلے 'الف' آتا ہے۔ ہمارے مجوزہ نام سے اردو کے حرف کی حق تلفی ہوگی اور ناقد اور قواعد دان ایسے نکتوں کو نظر انداز نہیں کریں گے اس لیے مصلحت اور انصاف دونوں کا تقاضہ رہا کہ نام میں ترمیم کی جائے اور اس کتاب کا نام "الف تحاشا"

رکھا جائے۔

میں کتاب کا دیباچہ لکھنے سے بہت کتراتا ہوں۔ دیباچے کا صرف ایک جواز جو مجھے پسند آیا ہے وہ شفیق الرحمٰن صاحب کی دین ہے۔ انھوں نے ایک بار اپنی ایک کتاب کے مختصر سے دیباچے میں لکھا تھا کہ وہ یہ دیباچہ صرف یہ بتانے کے لیے لکھ رہے ہیں کہ اس وقت وہ لندن میں ہیں۔ کتاب اردو کی اور دیباچہ پر لندن کی ڈیٹ لائن ——— بھئی کیا بات ہے! اب حیدرآباد ڈیٹ لائن سے دیباچہ کیا لکھنا! ایسی حالت میں دیکھئے قدرت نے ہماری کیسے مدد کی اور اس طرح ہماری عزت بھی رکھ لی۔ مجھے بیماریٔ دل کے لیے امریکہ جانا پڑ رہا ہے۔ اس لیے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں اپنا دیباچہ امریکہ کے مشہور ہسپتال کے سرجری روم سے لکھ بھیجوں۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ ادیب چاہے کتنا ہی عالی مرتبت کیوں نہ ہو، سرجری روم میں دیباچہ لکھنے کی اجازت کم از کم امریکہ میں تو نہیں دی جا سکتی، ہاں اُسے وہاں سے ریلیز کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی دل کے آپریشن کی بات ہے خدانخواستہ اگر.... (ہیرو ابھی اتنا ہی کہہ پاتا ہے کہ اس کی بیوی، بلکہ محبوبہ ایکدم اس کے مُنہ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر کہتی ہے "ہائے ایسی بدشگونی کی باتیں کیوں کرتے ہو؟") اس لیے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ طے پایا (بلکہ میں نے طے کیا، اس میں کوئی سازش کا عنصر نہیں) کہ دیباچہ لکھا حیدرآباد میں جائے، اور ریلیز امریکہ سے کیا جائے۔ ایسا دو آتشہ دیباچہ لکھنے سے کم از کم دیباچہ کے معاملہ میں تو میں شفیق الرحمٰن سے بھی بازی لے گیا۔

دیباچہ میں شکریے بھی ادا کئے جاتے ہیں۔ میں اگر شکریہ ادا کرنا شروع کروں تو صفحوں کے صفحے سیاہ ہو جائیں گے اور پھر بھی میں سرخرو نہیں ہو پاؤں گا

پھر بھی روایت سے ادیب کتنا بھاگ سکتا ہے۔ آخر امریکہ سے واپس تو آنا ہی ہے (آمین!)
اُن دوستوں اور اداروں کو جن کا احسان مند ہوں، کیا مُنہ دکھاؤں گا (وہی جو، وہ
اتنے برسوں سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں) زندہ دلانِ حیدرآباد جو اس کتاب کو شائع
کرنے کی ایک عرصہ سے ترغیب دیتے رہے، مصطفےٰ کمال جنھوں نے کاتب کا اتنا
پیچھا کیا، میرے خط اور ٹائپ کو سمجھنے میں کاتب کی رہنمائی کی ــــــ ڈاکٹر
گوپی چند نارنگ ــــــ جنھوں نے مسودے کو خود پڑھ کے بذاتِ خود میری دہشت
کی شناخت کی اور پھر خود مقدمہ میں میری پیروی کی! اِن سب کا میں تہِ دل سے شکریہ
ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

خوش نویس محمود سلیم کا بھی احسان مند ہوں کہ اُنھوں نے اپنی گوناگوں
مصروفیات کے باوجود ایک سال کے اندر اندر کتابت کا کام ختم کر دیا۔ اُردو میں
کاتبوں کی سپلائی اتنی کم اور ڈیمانڈ اتنی زیادہ ہے کہ اگر یہی حال رہا تو وہ وقت
دور نہیں جب اُردو کتابوں کے لیے دوسری زبانوں کے کمپوزیٹروں کی مدد لینی پڑے گی
میں خود بھی سوچتا ہوں کہ کیوں نہ یہ پارٹ ٹائم کام شروع کر دوں۔

زندہ دلانِ عالم، اردو ادب کے پرستارو، طنز و مزاح کے دلدادو، میری
کچھ بھی حالت ہو، میری دُعا ہے کہ آپ یہ کتاب پڑھیں، اس سے محظوظ ہوں اور
خوش و خرم رہیں۔

نریندر لوتھر

حیدرآباد ۳۰ ستمبر ۸۵ء

25-اکتوبر 1985ء ہوسٹن، امریکہ

مقدّمہ

حکومت ہند کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے جو بہت اچھا ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ حال ہی میں ایک موقع پر فرمایا کہ عہدے کی منصبی ذمّہ داری منکوحہ بیوی کی طرح ہے اور ادب کے کاروبار شوق کی حیثیت ایک داشتہ کی ہے۔ یہ بات ادب کے اور کسی شعبے پر صادق آتی ہو یا نہیں، طنز و مزاح کی دنیا پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ اِدھر حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے کیسی کیسی شخصیتیں اُٹھی ہیں۔ ان میں سوائے ایک دو کے جن کا تعلق اخباروں کی دنیا سے ہے باقی سب کے سب یا تو انتظامیہ سے متعلق ہیں یا ان کی اپنی اپنی منصبی ذمہ داریاں ہیں اور طنز و مزاح کو انھوں نے دونوں بلکہ تینوں معنی میں "داشتہ آید بکار" کے طور پر رکھ چھوڑا ہے۔ خواجہ عبدالغفور جن کو مرحوم لکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے، بھارت چند کھنہ، یوسف ناظم، نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین، رشید قریشی، شیخ انجم سب اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں کچھ عجب نہیں کہ یوسف ناظم بھی پہلے اسی راہ پر چلے ہوں، پھر انھوں نے

منکوحہ سے منہ موڑ کر داشتہ کے ساتھ پیمانِ وفا باندھ لیا ہو۔ زیرِ نظر مجموعے کے مصنف نریندر لوتھر نہایت مستقل مزاجی سے دونوں سے نباہ کئے جاتے ہیں تبھی تو یہ ان کی تیسری اولاد معنوی ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پہلے ان کے دو مجموعے "بند کواڑ" اور "مزاج پرسی" شایع ہو کر اہلِ ظرافت سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ نریندر لوتھر ماشاء اللہ آئی۔اے۔ایس آفیسر ہیں، آندھرا پردیش اور مرکزی حکومت میں کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں صنعتی ترقی کی مشاورت کے لیے حکومت لیبیا کی نظر انتخاب بھی ان پر پڑی وہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے جو صحیح معنوں میں زندہ دل اور زندہ عزم خواتین و حضرات کی جماعت ہے، صدر بھی ہیں۔

طنز و مزاح انسانی اظہار کی ایسی خصوصیت ہے جس کے لیے نظم و نثر یا شاعری کی قید نہیں کیونکہ یہ وہ جوہر ہے جس کے بغیر زندگی کا کوئی مرقع مکمل نہیں۔ اس کی جھلک تمام اچھے ادب میں کسی نہ کسی پیرائے میں ضرور ملتی ہے اُردو شاعری میں تو اس کی روایت خاصی قدیم ہے لیکن نثر میں بھی اس کی عمر ایک صدی سے تجاوز کرنے لگی ہے۔ وہ خصوصیت جو کبھی داستانوں ناولوں یا مکاتیب میں اپنی جھلک دکھاتی تھی اور پھر اخباروں کے فکاہیہ کالموں کے ذریعہ ترویج پاتی رہی بیسویں صدی میں قدم رکھتے ہی وہ کچھ افسانے میں چمکی اور پھر انشائیوں مضامین اور خاکوں میں بسیرا کرنے لگی۔ اخباروں کے فکاہیہ کالموں میں اس کا تمول دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اس نے اپنی ادبی شناخت انشائیوں اور خاکوں ہی کے ذریعہ کرائی ہے۔ نریندر لوتھر نے شروع میں کچھ کہانیاں اور ایسے مضامین لکھے جن کا ڈھانچہ واقعاتی تھا لیکن

بعد میں جب انھوں نے اپنی تخلیقی شخصیت کو پوری طرح پالیا تو وہ اس طرح کے انشائیے لکھنے لگے جہاں سلسلۂ کلام کی بنیاد شگفتہ نگاری پر قائم ہوتی ہے۔ یہ مزاح کی لطیف ترین سطح ہے جہاں مصنف زندگی کے کسی مضحک پہلو کو لیتا ہے یا روزمرہ کے معمولات کے کسی رُخ کو پیش کرتا ہے۔ اور بات سے بات نکالتے ہوئے ایسی چیزوں کے بھی مضحک پہلو کو دکھاتا جاتا ہے جو عام قاری کی نظروں سے اصلاً پوشیدہ ہوتا ہے۔ نریندر لوتھر نے شخصی خاکے بھی لکھے ہیں اور حیدرآباد کا تاریخ جغرافیہ بھی پیش کیا ہے، لیکن ان کے لطیف ترین مضامین وہ ہیں جن میں سامنے کی باتوں میں دلچسپ پہلو نکالے گئے ہیں۔ اس دُنیا میں ہر شخص شہرت کے پیچھے بھاگتا ہے۔ یہ بات انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ شہرت کا متلاشی ہوتا ہے۔ نریندر لوتھر نے اپنے مضمون "گمنامی کی برکتیں" میں لوگوں کی تین قسمیں کی ہیں، وی آئی پی۔ آئی پی۔ اور صرف پی یعنی بہت اہم شخص، اہم شخص اور صرف شخص۔ مضمون کے شروع کے حصّے میں، لطیف طنز ہے اور بتایا ہے کہ شہرت کے تعاقب میں انسان کیا کیا حیلے نہیں کرتا مثلاً:

> "اگر وہ اپنے گھر کے سامنے والی نالی کی مرمّت کی درخواست لے کر بلدیہ جاتا ہے تو اخباروں میں یہ بیان دیتا ہے کہ اس نے بلدیہ کے کمشنر سے مل کر ان کی توجہ محلہ کی صفائی کی ضرورت کی طرف مبذول کروائی ہے اور کمشنر صاحب نے انھیں جلد ہی اس طرف رجوع ہونے کا تیقن دلایا ہے۔ ایسے شخص کی گھر کی حالت بے شک دگرگوں ہو، اسے دن میں دو وقت کا کھانا

بھلے ہی نصیب نہ ہو، اس کے گھر میں چاہے پتلی سی دال جوتیوں
میں بٹتی ہو، لیکن اُسے شہرت کی دُھن زندہ رکھے رہتی ہے۔
اس کا یہ عقیدہ رہتا ہے کہ اور نہیں تو کم از کم اس کے دو
بیانات، ایک پیغام اور ایک تصویر فی ہفتہ جنتا کو ضرور
پہنچنی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو تو جنتا کا بُرا حال ہو جائے گا۔"
بعد میں وہ گریز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کبھی آپ نے گمنامی کے فائدوں
پہ غور کیا ہے! شہرت کی ہوس میں گرفتار انسان کو اپنا دل، دماغ، اپنا
وقت اور اپنا ضمیر دوسروں کو بیچنا پڑتا ہے۔ ضمیر کا ذکر آگیا تو دیکھیے
شگفتہ نگاری کا حق کس خوبی سے ادا کیا ہے:

"ویسے ضمیر بیچنا کوئی آسان کام نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ
آپ اپنا ضمیر بیچنے جائیں تو خریدنے والے صاحب کہتے ہیں نہیں صاحب
ہم تو خود اپنا ضمیر بیچنے کی فکر میں ہیں، آپ کا ضمیر لے کر کیا
کریں گے۔ ہاں اگر خود ہمارا ضمیر کہیں بک گیا تو پھر خرید
لیں گے یا آپ کا ضمیر بھی بکوا دیں گے۔ اگر کوئی شخص ضمیر خریدنے
کے موقف میں ہو بھی تو آپ کا ضمیر ٹٹول کر تول تال کر ایک لمبی
سانس بھر کر کہتا ہے 'معاف کیجئے آپ کا ضمیر تو کچھ بوجھل سا
دکھائی پڑتا ہے۔ ہمیں تو کسی ہلکے پھلکے ضمیر کی تلاش'
ضمیر کا بیوپاری بے چارہ اپنا سا مُنہ لے کر واپس ہوتا ہے اور
کسی خریدار کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔"

اس مضمون کی تان اس بات پہ ٹوٹتی ہے کہ ہماری زندگی میں ... تارہ

باتیں یا حرکتیں ایسی ہیں جن سے ہماری آزادی کو معنی ملتے ہیں اور مشہور
آدمی کا ان سب پر اختیار نہیں ہوتا۔ اس کی آزادی محدود ہو جاتی ہے،
گمنام آدمی آزاد ہے۔ وہ سر اونچا کر کے کہیں بھی جا سکتا ہے اور "نام آور
شخص آرام سے اپنے بیوی بچوں سے بھی بات چیت نہیں کر سکتا اس کے برعکس
گمنام آدمی نہ صرف اپنے بیوی بچوں بلکہ دوسروں کی بیویوں اور بچوں کے ساتھ
رہ سکتا ہے۔"

ایک اور مزے کا مضمون ہے "بڑا آدمی"۔ نریندر لوتھر کی بڑی خوبی یہ
ہے کہ کسی بھی اچھے مزاح نگار کی طرح وہ طنز سے صرف اتنا کام لیتے ہیں کہ عام
زندگی یا معاشرت کی کجیوں کی طرف اشارہ ہو جائے اور ہنسنے ہنسانے کا سامان
بھی فراہم ہوتا جائے۔ اچھی شگفتہ تحریر کی ایک پہچان اس کی ابتدا ہے — اگر
شروع ہی سے وہ قاری کی توجہ کو جذب نہ کر لے تو قاری زیادہ دیر تک
ساتھ نہیں دے گا۔ "بڑا آدمی" کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"ایک بار ایک جرنلسٹ نے جو کسی گاؤں پر ایک مضمون لکھ رہا
تھا، وہاں کے ایک نوجوان سے پوچھا "اس گاؤں میں کوئی
بڑا آدمی پیدا ہوا ہے؟ نوجوان نے جواب دیا "جی نہیں، اس گاؤں
میں ہمیشہ بچے ہی پیدا ہوئے ہیں۔"

ہمارے معاشرے نے جس طرح پچھلے سینتیس ۳۷ برسوں میں ترقی کی ہے
اس سے سیاست کے معنی بالکل تبدیل ہو گئے ہیں۔ کسی زمانے میں بڑا آدمی علوم و
فنون، فکر و فلسفے، مذہب و روحانیت کی دنیا میں پایا جاتا تھا۔ اب
بڑا آدمی سیاست میں پایا جاتا ہے۔ یہ بڑا آدمی ملک اور قوم کی کتنی بڑی

خدمت کرتا ہے، نریندر لوتھر کے الفاظ میں سُنئے:

"بڑا آدمی زندگی کے ہر شعبے میں پایا جاتا ہے۔ زندگی کا کوئی حصہ اس سے بچا نہیں رہتا۔ ہر کام میں، ہر پیشے میں، ہر محکمہ میں ہر گوشہ میں بڑا آدمی مل جاتا ہے لیکن سب سے زیادہ اہم بڑا آدمی سیاست میں ملتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے اور اس طاقت کا استعمال وہ دوسروں کے لیے یا ان کے خلاف کر سکتا ہے۔ اس لیے بڑا آدمی انسانیت کو دو گروہوں میں بانٹ دیتا ہے۔ اس کے پیروکار اور اُس کے مخالف۔ اگر بڑے آدمی نہ ہوتے تو انسانیت کے ٹکڑے نہ ہوتے۔ ہر زمانہ میں، ہر ملک میں، ہر شعبہ میں جب بھی کوئی بڑا آدمی اُٹھتا ہے تو سماج ملک، قومیں، برادری بٹ جاتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں اگر کوئی بڑا آدمی نہ ہوتا تو مختلف قومیں نہ ہوتیں، مذہب نہ ہوتے، فرقے نہ ہوتے، آپسی تنازعے نہ ہوتے۔ ساری دُنیا ایک کُنبہ ہوتی"!

نریندر لوتھر کا ایک اور مضمون جو مجھے بے حد پسند ہے "سویرے کی سیر" ہے۔ ان کے مضامین پڑھتے ہوئے ذہن بے اختیار پطرس کی طرف جاتا ہے لکھتے ہیں ــ

"ہم نے کئی بار سیر کرنا شروع کیا لیکن چھ روز کے بعد وہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا"۔ اِسی بات کو ایک اور طرح یوں بیان کیا ہے، کسی پارٹی میں ایک شخص نے ڈینگ ماری۔ میں نے آج سے

سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے۔ پاس ہی کھڑے ہوئے اس کے ایک دوست نے للکارا "واہ اس میں کیا بڑی بات ہے، میں نے تو کئی بار سگریٹ پینا چھوڑا ہے۔"

یہ مضمون شاہکار ہے۔ اس میں ہر پیراگراف میں شگفتہ نگاری کی اچھی مثالیں سامنے آتی ہیں، لکھتے ہیں:

دلّی میں ایسے کئی پارک سرکار نے بنائے جہاں سیر بڑی اچھی طرح کی جا سکتی ہے۔ ایک ایسے ہی پارک کے پاس ہمیں گھر مل گیا۔ پس ثابت ہوا کہ باقاعدہ سیر کے لیے ایک پارک کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ ایک عدد پارک خرید ہی لیں۔ اگر آپ کے پاس اتنا پیسہ نہ ہو تو پارک کے نزدیک ایک عدد گھر خرید لیں۔ اگر اس میں بھی کچھ دقّت ہو تو پارک کے نزدیک ہی مکان کرایہ پر لے لیں۔ اگر اتنا بھی نہ کر سکیں تو کسی طریقہ سے پارک تک پہنچنے کا انتظام کر لیں۔ کار پر، سکوٹر پر، سائیکل پر۔ اگر آپ اپنی ٹانگوں پر ہی وہاں پہنچیں گے تو وہاں تک پہنچتے پہنچتے ہی آپ کی سیر ختم ہو جائے گی۔"

مصنّف نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ صبح کی سیر صرف امیر یا متوسط طبقے کے لوگ کرتے ہیں۔ غریب لوگ اس وقت کام پر جاتے ہیں اس لیے انھیں سیر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آگے چل کر اس پر بھی تبصرہ فرمایا ہے کہ سیر کرنے سے اگرچہ صحت اچھی رہتی ہے لیکن ہم نے سیر کرنے والوں کی خرابیٔ صحت بھی دیکھی ہے اور سیر نہ کرنے والے صحت مند لوگ بھی دیکھے ہیں۔ ذرا میاں بیوی کے اکٹھے سیر کرنے کا یہ منظر دیکھئے:

"اگر خاوند اور بیوی اکٹھے سیر کو جائیں تو جہاں خاوند کے صرف پاؤں چلتے ہیں وہاں بیوی کے پاؤں کم اور زبان زیادہ چلتی ہے، قدرتی بات ہے بے چاری کو تمام رات خاموش سونا پڑتا ہے۔ صبح ہونے پر مرد سب سے پہلے آنکھ کھولتا ہے اور عورت زبان۔ سیر میں خاوند کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اگر وہ بیوی کی باتیں نہ بھی سُنے تو بھی بیوی درختوں اور جھاڑیوں سے مخاطب ہو سکتی ہے اور اسے یہ بھرم رہتا ہے کہ اس کی باتیں سُنی جا رہی ہیں۔ اس لیے بیوی کی خوشی کے لیے سیر ایک مفید چیز ہے، ہم نے بیگم کو اس شرط پر اپنے ساتھ سیر کے لیے لے جانا شروع کیا کہ وہ سیر کے دوران خاموش رہیں گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد انھوں نے سیر کرنا چھوڑ دیا۔ کہنے لگیں کہ آپ تو ہوا خوری کرتے ہیں اور میں گھٹن سے مرتی ہوں۔"

کامیاب مزاح نگار کا کمال یہی ہے کہ روزمرہ زندگی کے بے رنگ اور سپاٹ مناظر میں کوئی انوکھی چیز ڈھونڈ لے یا پھر کسی مضحک پہلو کو ذرا مبالغے کے ساتھ پیش کرے۔ جو لوگ کتوں کو ساتھ لے کر سیر کرنے نکلتے ہیں ان کی ہیئت کذائی پر نریندر لوتھر کا یہ تبصرہ خاصا مزے کا ہے:

کتوں کے ساتھ سیر کرنے والوں کو دیکھ کر یہ پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ مالک کون ہے اور کون کس کو سیر کروا رہا ہے۔ کتا صاحب کو جگہ جگہ روکتا ہے، تیز تیز آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے یا سُست رفتاری سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ کبھی وہ اِک دم رُک جاتا ہے۔ گھاس کے پتّے یا پتھر یا کسی کھمبے کو سونگھنا شروع کر دیتا ہے،

اور ایک جگہ چُن کر اسی کے گرد گھومنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر وہ ایسے اطمینان سے وہاں رُک جاتا ہے گویا منزلِ مقصود مل گئی۔ اس وقت کتّے کا مالک اپنی خفّت چھپا کر بڑی بے نیازی سے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیتا ہے کہ اس بدتمیز جانور سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ ہم نے کئی بار ایسے اٹکے ہوئے صاحبوں کو "اوورٹیک" کیا ہے۔"

جن حضرات کو حیدرآباد کی قدیم اور جدید تہذیب سے دلچسپی ہے، وہ "حیدرآباد کا تغرافیہ" پڑھ کر ضرور محظوظ ہوں گے۔ نریندر لوتھر نے تاریخ اور جغرافیہ کو ملا کر نئی اصطلاح وضع کی ہے۔ اِس میں نہایت دلچسپ پیرائے میں تاریخ کا بھی جائزہ لیا ہے اور جدید جغرافیے کی بھی وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ حیدرآباد میں دو منزلہ بسیں عام ہیں۔ ایک منزل میں ٹکٹ خریدنے والے مسافر ہوتے ہیں دوسری منزل کے مسافر فری سفر کرتے ہیں۔ سڑکوں پر جگہ جگہ بس اسٹینڈ بنائے گئے ہیں لیکن دراصل یہ بس اسٹینڈ نہیں بلکہ پبلک اسٹینڈ ہیں۔ لوگ یہاں کھڑے رہتے ہیں۔ بس یا تو ان سے کچھ پہلے یا کچھ آگے ہی رُکتی ہے۔ مسافروں کو وہاں تک بھاگ کر بس پکڑنی پڑتی ہے اس جبری کسرت کی وجہ سے حیدرآباد کے لوگوں کی صحت اچھی رہتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ کرایہ دینے کے بھی یہاں دو سسٹم ہیں۔ اگر آپ ٹکٹ خریدنا چاہتے ہیں تو کرایہ پورا لگتا ہے اگر آپ ٹکٹ خریدنے پر اصرار نہ کریں، تو آپ آدھے کرایہ ہی پر سفر کر سکتے ہیں، اس لیے کہ اس سے کمپنی کا ٹکٹیں چھپوانے کا خرچ بچتا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ "حیدرآباد کے مختلف محلوں کے نام جسم کے حصّوں یا بیماریوں پر رکھے گئے ہیں۔

مثلاً امیر پیٹ، بیگم پیٹ، رحیم پیٹ وغیرہ، بلغم پیٹ بھی ایک محلے کا نام ہے۔" حیدرآباد کی جھیلوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں جھیلوں کو ساغر (ساگر) کہا جاتا ہے۔ امرود کو جام کہتے ہیں۔ روایت ہے کہ امرود کھا کر اگر کسی جھیل کا پانی پی لیا جائے تو جام نوش کرنے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔" یہاں کے لوگوں کی سلیقہ شعاری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "یہاں کے لوگ گورنر اچھے بنتے ہیں اس لیے یہاں کے کئی معزز شہریوں کو گورنر بنا کر دوسرے صوبوں کو برآمد کیا گیا ہے۔" سروجنی نائیڈو، پدمجا نائیڈو، رام کرشنا راؤ، نہری نگیش، علی یاور جنگ، گوپال ریڈی، اکبر علی خاں، یہ سب یہیں سے گورنر بن کر گئے۔ یہاں کے گورنر اتر پردیش میں خاص طور سے پسند کئے جاتے ہیں۔

نریندر لوتھر کا ایک شاہکار خاکہ "اندرا کلیس حسین" ہے۔ یہ خاکہ مجتبیٰ حسین پر لکھا گیا ہے۔ اس میں بعض مزے کے لطیفے بیان کیے ہیں۔ اس خاکے کی شانِ نزول کے بارے میں گل افشانی ملاحظہ ہو۔

مجتبیٰ کا خاکہ اڑانے کا خیال اکثر میرے دل میں آیا۔ لیکن اس مضمون کی ناقابل برداشت تحریک اس وقت ملی جب زندہ دلانِ حیدرآباد کا خط آیا۔ ایسے موقعوں پر مجتبیٰ اکثر مجھے فون کرتا ہے اس بار جو فون کیا تو کہنے لگا "میرا جانا تو شاید مشکل ہو، ابھی ابھی حیدرآباد سے لوٹا ہوں۔ اتنی جلدی دوبارہ جا نہیں پاؤں گا۔ حکومت اردو پر کتنی ہی مہربان کیوں نہ ہو کب تک دفتر سے میری غیر حاضری کو معاف کرے گی؟" مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ

حیدرآباد کے جلسہ میں جو ہماری دانست میں، ہندوستان بلکہ برِصغیر کا سب سے بڑا طنز و مزاح کا فنکشن ہے، وہاں کورم نہ ہو میں نے اصرار کیا۔ مجتبیٰ نے روایتی ہوں ہاں کی۔ اِصرار میں یہی خوبی ہے۔ اس کا جواب سطحی حیل و حجّت میں ملتا ہے۔ پھر میں نے فوراً کہا۔ دیکھو میں تم پر ایک خاکہ پڑھنا چاہتا تھا۔ اگر نہیں آؤ گے تو پھر کوئی اور مضمون لکھوں گا۔ سُنتے ہی مجتبیٰ نے جواب دیا اگر یہ وعدہ ہے تو پھر حیدرآباد چلتا ہوں۔ اس کے بعد اب مجتبیٰ نے مجھے روز فون کرنا شروع کر دیا۔ کسی نہ کسی بہانے بظاہر میرا حال پوچھنے، خیر و عافیت دریافت کرنے۔ حیدرآباد کب جانا ہے، پروگرام تو پکّا ہے کہیں منسوخ تو نہیں ہو جائے گا اور بہت ہی ضمنی طور پر۔ وہ خاکے والی بات کا کچھ ہوا ــــ؟"

یہ حقیقت ہے کہ مجتبیٰ حسین طنز و مزاح کی محفلیں برپا کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ کم از کم شمال میں تو اِس اعتبار سے سنّاٹا ہی تھا۔ مجتبیٰ کے دہلی آنے سے شمال اور جنوب کی طنابیں کھنچ گئیں۔ نئے سلسلے پیدا ہوئے، گویا سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ ان سرگرمیوں کا یہ منظر بھی دیکھئے:

پچھلے چند سالوں سے فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین اور مجھے۔ تینوں کو محفلوں میں اِکٹھے جانے اور مضامین پڑھنے کی عادت اتنی ہو گئی ہے کہ کسی محفل میں کسی ایک کا اکیلے جانا ممکن ہی نہیں لگتا۔ تینوں میں سے کم از کم دو کا کورم ہوتا ہے اور اس کورم کے بغیر قومی سطح پر طنز و

مزاح کی کوئی محفل منعقد نہیں ہوسکتی ۔ ادبی جلسوں میں اکٹھے جاتے جاتے اور پڑھتے پڑھتے اب یہ عالم ہو گیا ہے کہ ہم کو ایک دوسرے کے بیشتر مضامین زبانی یاد ہو گئے ہیں ۔ چند ہفتوں کی ہی بات ہے کہ ہماری مزاحیہ تکون امروہہ میں مجموعی طور پر مدعو تھی ۔ میں پہلے فکر صاحب کے گھر پہنچا اور اُن کو لے کر ہم مجتبیٰ کے گھر کی طرف چلے ۔ راستے میں اچانک فکر صاحب گویا ہوئے ــــ

" اوہو! ذرا واپس چلیے ۔ میں مضمون لانا تو بھول ہی گیا "۔

میں نے کہا " پہلے ہی دیر ہو گئی ہے ۔ اب واپس نہیں جا سکتے آپ یا تو جیسا عموماً کرتے ہیں میرا ہی کوئی مضمون پڑھ ڈالیے یا مجھے بتا دیجئے کون سا مضمون سنانا چاہتے ہیں ، میں زبانی سُنا دوں گا "۔ نتیجتاً فکر صاحب نے اپنے نام سے میرا ہی لکھا ہوا مضمون وہاں سُنایا ۔ بہت داد ملی ۔ ہم تینوں بہت خوش ہوئے ۔ فکر صاحب ایکٹر کی حیثیت سے ، میں پلے بریک کی حیثیت سے اور مجتبیٰ ڈائرکٹر کی حیثیت سے "۔

بیوی کا کردار کچھ اس نوعیت کا ہے کہ تقریباً تمام مزاح نگاروں نے اس کا بے حد استحصال کیا ہے ۔ کم از کم فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین نے تو اس سلسلے میں ایسا کمال دکھایا ہے کہ اگر خواتین کی انجمن آزادیٔ نسواں کو تمام تفصیلات کا علم ہو گیا تو ان حضرات پر شدید ترین مرد پرست عورت دشمن مزاح نگار ہونے کا الزام لگ سکتا ہے ۔ نریندر لوتھر بھی کبھی کبھی شوقیہ اس کوچے میں تفریح کے لیے آ نکلتے ہیں ۔ مجتبیٰ کی بیوی کا سہارا لے کر مزاح نگار

دراصل اپنے دل کی بات کہنا چاہتا ہے۔

اب اس کی بیگم کا ذکر آیا ہے تو ایک اور بات بھی عرض کر دوں۔
بیوی کے بارے میں مجتبیٰ کا نقطۂ نظر کلاسیکی ہے جس کے مطابق
گھر کی چار دیواری ہی بیوی کی مناسب جگہ ہے۔ اس نے دہلی
ٹی وی پر جب ہم بیویوں پر پروگرام کر رہے تھے، علانیہ
کہہ دیا تھا کہ اس کا اپنی بیوی کے ساتھ واسطہ، مہینہ میں ایک
بار پڑتا ہے۔ اُس شام کو وہ تنخواہ لے کر گھر آتا ہے جو بیوی کی
جھولی میں ڈال دی جاتی ہے۔ اس کی باقی ماندہ حرکات وسکنات
اور نقل وحمل کا پتہ بیگم کو رسالوں، اخباروں، ریڈیو، ٹی وی اور
افواہوں سے ملتا رہتا ہے۔ ویسے میں اس تھیوری کو نہیں مانتا
میرا خیال ہے کہ وہ چوری چھپے مہینے میں ایک بار سے زیادہ اپنی
بیوی سے مل لیتا ہے۔ ایک مہینہ میں کم ازکم دوبار تو میں نے بھی
اسے اس کے گھر میں ہی پکڑا ہے۔ ویسے یہ آسان کام نہیں کیونکہ وہ
بقول خود علی الصبح گھر واپس آتا ہے اور علی الصبح گھر سے نکل پڑتا ہے۔
میں اس معاملہ میں مجتبیٰ سے رشک کرتا ہوں کیونکہ مجھے تو اپنی بیوی
کو نہ صرف کمائے ہوئے پیسے پیسے کا بلکہ گنوائے ہوئے وقت کے
پل پل کا حساب دینا پڑتا ہے۔ اگر اُس سے اس کامیاب پالیسی
کا راز پوچھا جائے تو وہ اس کا جواب فارسی میں دیتا ہے ۔۔۔

"گربہ کشتن روز اوّل"

زیرِ نظر مجموعے میں ایسی کئی تحریریں ہیں جن میں بیوی کے تصوّر کا جائزہ

ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے "ستاروں کے کھیل" کا مرکزی خیال یہی ہے کہ لوگ ستارے دیکھ کر نجومیوں سے پوچھ کر اور شبھ گھڑی نکلوا کر شادی بیاہ کرتے ہیں، لیکن شادیاں ناکام بھی ہو جاتی ہیں۔ مہورتوں اور شبھ گھڑیوں کے بار بار فیل ہو جانے کے باوجود ہمارا اعتبار ستاروں پر برقرار رہتا ہے۔ ایک مضمون "میاں بیوی" پر ہے۔ لکھتے ہیں کہ "امریکہ اور روس کے باہمی تعلقات دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ملک نہیں میاں بیوی ہیں۔" اس میں سارا لطف اسی بات سے پیدا کیا ہے کہ شادی تضاد کا رشتہ ہے، سب سے پہلے جنسی تضاد یعنی ایک نر دوسرا مادہ، پھر فطرت کا تضاد، ایک باہر کی طرف مائل تو دوسرا اندر کی طرف ایک آزادی پسند دوسرا غلامی پسند، ایک کو گرمی لگتی ہے تو دوسرے کو سردی، ایک سونا چاہتا ہے تو دوسرا جاگنا۔ ان میں سب سے مزے کا خاکہ "بڑی بھول کی" ہے۔ فرماتے ہیں۔
"شادی نہ کرنا بڑی بھول ہے۔ اس سے بھی بڑی بھول شادی کرنا ہے۔ ہم ہر دو کے مرتکب ہو چکے ہیں۔" اس میں دبّو خاوندوں کے کلب کے اراکین کو مشورہ دیا ہے کہ "دنیا کی ریت ہے کہ جوڑے میں سے ایک نوکری کرتا ہے اور دوسرا حکم چلاتا ہے۔ اگر دونوں نوکری شروع کر دیں تو شادی کا ادارہ خطرے میں پڑ جائے گا۔ وہ لوگ جو بیوی کی ملازمت کے خلاف ہیں، غلطی پر ہیں۔ مصنّف کی رائے ہے کہ "اگر ہو سکے تو بیوی سے ملازمت کروائیں اور خود نوکری چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھر کے راجا بن کر مزے سے زندگی گزاریں۔"

اوپر کی چند مثالوں سے اندازہ ہوا ہو گا کہ نریندر لوتھر مزاح نگاری کے کس درجہ پر فائز ہیں۔ اردو مزاح نگاری میں اب تک دو اسلوبیاتی دھارے

خاص کر سامنے آ چکے ہیں۔ ایک جو پطرس اور کنہیا لال کپور کی یاد دلاتا ہے، یعنی جو خوش طبعی، کھلنڈرے پن اور کھلے ڈلے شگفتہ انداز سے عبارت ہے اور دوسرا جو رشید احمد صدیقی کی یاد دلاتا ہے اور اب مشتاق احمد یوسفی سے منسوب ہے یعنی متانت آمیز مزاح جس میں ادبیت اور شعریت کی چاشنی غالب ہے خوش طبعی اور شگفتگی یہاں تبسمِ زیرِلب کی حیثیت رکھتی ہے۔ نریندر لوتھر کا تعلق پہلی قسم سے ہے۔ انھوں نے ایک دو جگہ اشعار کا فائدہ اٹھانا چاہا ہے لیکن وہ اس کوچے کے آدمی نہیں۔ ایک دو قدم چل کر خود محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اجنبی ماحول میں آ گئے۔ ان کی مزاح نگاری روزمرّہ زندگی کے معمولی اور مضحک پہلوؤں کے بے محابا اور کھلے ڈلے بیان پر مبنی ہے۔ اس کا اپنا مزہ اور اپنی کیفیت ہے۔ نریندر لوتھر اس منزل پر ہیں جہاں انھوں نے اپنا لہجہ، اپنی آواز اور اپنا انداز پا لیا ہے۔ ادب کی دنیا میں آئے دن ایسی نامور شخصیتوں سے ملاقات ہوتی رہتی ہے جو کئی نسلوں سے ادب کے دشت کی سیاحی میں سرگرداں ہیں اور کئی کوچہ و مقام سے گزر چکے ہیں لیکن دوسروں کے لہجے میں بولتے اور دوسروں کے ذہن سے سوچتے ہیں۔ اپنے انداز کو پا لینا اور اپنے ذہن سے سوچنا اور اس طرح سوچنا کہ روزمرّہ زندگی کے معمولی پہلوؤں میں غیر معمولی پہلو اور خشک اور بے روح واقعات میں ہنسنے ہنسانے کے نکتے سوجھ جائیں اور چابک دستی سے وہ اظہار و بیان کی زد میں بھی آ جائیں، ایسی نیکی اور خوبی ہے جو سب سے خراجِ تحسین وصول کر سکتی ہے۔ خدا نہ کرے کہ ہم منکوحہ بیوی کے خلاف لب کشائی کریں، لیکن یہ تمنّا ضرور ہے کہ — نریندر لوتھر کے تعلقات اپنی داشتہ سے بدستور استوار رہیں۔

۱۸۔ جنوری ۱۹۸۵ء

پروفیسر گوپی چند نارنگ

پکڑے جاتے ہیں....

انگریزی مصنف ای۔ ایم فاسٹر کے مطابق انسانی زندگی میں پانچ اہم واقعات یا سانحات ہوتے ہیں۔ پیدائش، کھانا، سونا، سیکس اور موت۔ سیکس میں انسان محبت بھی شامل کرتا ہے بلکہ وہ محبت میں سیکس شامل کرتا ہے۔ ویسے عقلمند لوگ ان دونوں کو علٰحدہ ہی رکھتے ہیں ورنہ خواہ مخواہ پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پہلا اور آخری واقعہ زندگی میں صرف ایک بار درپیش ہوتا ہے باقی تو روزمرہ کی باتیں ہیں۔ انسانی زندگی ان ہی واقعات کے گرد گھومتی ہے اور ناول نگار ان ہی کو موضوع بناتے ہیں۔

ان میں سے چار سانحات سے مَیں گزر چکا ہوں بلکہ پہلے کو چھوڑ کر تین سانحوں سے بار بار دوچار ہوا ہوں اور جب تک آخری سانحہ نہ گزر جائے' یہ تینوں سانحات باقاعدگی اور بے اعتدالی کے ساتھ ہوتے رہیں گے۔ نتیجتاً آخری واقعہ بھی رُونما ہو جائے گا اور پھر میری سوانحِ حیات لکھنے کا کام کسی کے سپرد کیا جائے گا۔ وہ تحریر شاید پڑھنے کے قابل ہو۔ خاص طور پر طبّی صورت میں

جبکہ وہ مستقبل کا سوانح نگار میرا دوست یا مدّاح نہ ہو۔

ہمیں اکثر کئی قسم کے فارم بھرنے پڑتے ہیں۔ نوکری کے لیے، راشن کے لیے، پاسپورٹ کے لیے۔ جس طریقے سے ایک اُمیدوار نے اپنا فارم بھرا تھا اس طرز پہ میں اپنی زندگی کے حالات کو مختصر طور پر یوں بیان کر سکتا ہوں :

۱۔ پیدائش ______ ہو چکی

۲۔ کھانا ______ ہلکا۔ روز

۳۔ سونا ______ بھاری۔ روز رات کو

۴۔ سیکس ______ کبھی کبھی۔

۵۔ موت ______ ابھی نہیں۔ انتظار کیجیے

لیکن اس سے آپ کی تسلی نہیں ہوگی۔ چونکہ اس میں کوئی مبالغہ آمیزی کی گنجائش نہیں، اس لیے میری بھی تسلی نہیں ہوگی اس لیے کوشش کرتا ہوں کہ طرفین کی دلچسپی کو مدِّنظر رکھ کر کچھ تفصیلات قلمبند کروں

میری پیدائش کے بارے میں کچھ خاص بات نہیں لکھی جا سکتی۔ اس وقت نہ تو کوئی روشن تارہ طلوع ہوا نہ ہی بارش ہوئی اور نہ ہی کوئی اور خاص واقعہ رو پذیر ہوا۔ ایک متوسط سائز کے شہر میں، ایک متوسط گھرانے میں، موسم میں جب نہ گرمی تھی نہ سردی یعنی مارچ کے اواخر میں پانچوں بچہ اور تیسرا لڑکا پیدا ہوا۔ اس لحاظ سے اُس دور کے معیار سے کنبہ بھی متوسط تھا۔ عموماً بچے آدھی رات کے وقت پیدا ہوتے ہیں لیکن گھر کے لوگوں کی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے میں ناشتے کے وقت پیدا ہوا ہوں۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ

مجھے شروع ہی سے دوسروں کے آرام کا خیال رہتا ہے۔ آج کل کے بچّے اکثر ہسپتالوں میں پیدا ہوتے ہیں لیکن میں صحت مند تھا اس لیے گھر میں ہی پیدا ہوا ہسپتال جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ آج تک اِس عادت کو برقرار رکھے ہوئے ہوں ہسپتال جانے سے گریز کرتا ہوں۔ صرف بیماری کی صورت میں ہی اس طرف کا رُخ کرتا ہوں۔ البتہ یہ نوٹ کر لیجئے کہ میرے دونوں بچّے ہسپتال میں ہی پیدا ہوئے۔ اس لیے مجھ پر دقیانوسی ہونے کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔

چودہ، پندرہ سال تک میں نے کوئی معرکہ آراء کام نہیں کیا لیکن ۱۹۴۷ء میں ملک کو آزادی دلوانے میں میرا خاصا ہاتھ رہا۔ میں پنڈت نہرو کے ایک جلسہ میں حاضر تھا جس میں اُنھوں نے بار بار کہا تھا کہ ہم آزادی حاصل کر کے ہی رہیں گے اِس اعلان کو سُن کر میں نے بہت زور سے تالیاں بجائیں۔ اس کے علاوہ میں نے بیشتر قومی لیڈروں کی تقریریں پڑھیں اور سُنیں۔ اِس سے ہمارے لیڈروں کے حوصلے بلند رہے اور آزادی کی تحریک کو فیضان ملا۔ اور ایک بات جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ کارنامہ میں نے ایک بار بھی جیل گئے بغیر انجام دیا۔ اس کے علاوہ آزادی کی جد و جہد کے باوجود میں نے اپنی پڑھائی جاری رکھی اور ایم۔ اے تک تعلیم پائی۔ آزادی کی جد و جہد کی تاریخ میں ایسے مثبت رول کی مثال کم ملتی ہے، جس میں کسی شخص نے بیک وقت ہر کام پر مناسب توجہ دی ہو۔

تقسیم ہند کی وجہ سے میں جلا وطن ہو گیا لیکن اس کے باوجود حبّ الوطنی کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ میں نے اپنی زندگی ملک، قوم اور سرکار کی خدمت میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ آج کل ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ اس لیے مجھے ۱۹۵۵ء میں آئی، اے، ایس میں لے لیا گیا۔ میں نے ہر شعبہ میں، ہر طرح سے پبلک اور سرکار کی

خدمت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ابھی تک یہ کام پورا نہیں ہوا اور اسی لیے اب بھی اسی دُھن میں مُبتلا ہوں۔ حکومت ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ میں کس کام کے لیے موزوں ہوں۔ اس لیے کبھی یہاں کبھی وہاں، کبھی اِس محکمہ میں کبھی اُس محکمہ میں بھیجا جاتا ہوں۔ اس محکمہ بدوشی کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ افسر کی کمزوری اور نااہلی کا پتہ نہیں چل پاتا۔ یہ ایک قسم کی مُفت ٹریننگ ہے۔ جب ٹریننگ ختم ہو جائے گی تو پنشن دے کر گھر بھیج دیا جاؤں گا۔ اس وقت اپنی باقی ماندہ زندگی کے ساتھ فیصلہ کروں گا۔

معاف کیجئے۔ مَیں نے فاسٹر والے واقعات کا تسلسل برقرار نہیں رکھا۔ پیدائش کے بعد کھانا اور سونے کی بات ہونی چاہیئے تھی تو وہ بھی سن لیجئے۔ یہ دونوں کام میں بچپن سے کرتا آیا ہوں لیکن ایک اصول کو ہمیشہ مدِّنظر رکھتا ہوں۔ کھاتے وقت مَیں کبھی سوتا نہیں اور سوتے وقت کبھی کھاتا نہیں۔ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔ صبح جلدی اُٹھنے کی بجائے رات کو دیر تک اُٹھے رہنے کو ترجیح دیتا ہوں، ویسے مَیں نے کئی بار صبح اُٹھنے کی کوشش کی ہے لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اِس لیے اب دیر سے سونا بھی چھوڑ دیا ہے یعنی سونے اور جاگنے کے وقت میں اعتدال ہے۔ صبح سیر کرنے کی عادت ڈالنے کی خواہش بچپن سے ہے۔ اس میں بھی کامیابی وقتاً فوقتاً ہوئی تو سہی لیکن دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ پھر جان اب شام کی سیر پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ اس سے سوشل زندگی پر مُضر اثرات پڑتے ہیں لیکن آخر انسان میں کوئی نہ کوئی خاص بات تو ہونی چاہیئے۔ ہماری سیر چار پانچ کیلومیٹر لمبی ہوتی ہے اور اس میں پچاس منٹ کے قریب لگتے ہیں۔ اس طرح مَیں دس منٹ میں ایک کیلومیٹر چلتا ہوں۔ یہ رفتار بیل گاڑی کی رفتار سے زیادہ

ہے۔ شادی میں استعمال ہونے والی موٹر کاروں کی رفتار بھی ہماری رفتار سے کم ہوتی ہے پس ثابت ہوا کہ شادی سے ہر چیز کی رفتار میں کمی ہو جاتی ہے کبھی بار میں رات کو آٹھ بجے بھی سیر پر نکل جاتا ہوں اور غلطی سے کسی دوست کے گھر پہنچ جاتا ہوں۔ ایسی صورت میں رات کا کھانا کھا کر ہی واپس ہوتا ہوں۔ شام کی سیر کا یہ پہلو ہم سے پہلے شاید کسی نے دریافت نہیں کیا۔

اب آیئے چوتھے سانحے کی طرف ـــ محبت۔ ہاں اب جگر تھام کے پڑھنے بیٹھیں گے بلکہ شاید اُٹھ کھڑے ہوں لیکن آپ کو مایوسی ہوگی کیونکہ میں فی الوقت آپ کو 'سب کچھ' بتانے والا نہیں ہوں۔ داستان کا یہ حصہ پھر کبھی ـــ گر زندگی نے مہلت اور حالات نے اجازت دی ویسے آپ کا قیاس صحیح ہے۔ میں نے بارہا محبت کی ہے۔ محبت عجیب سی حالت کا نام ہے جس میں متضاد کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ دُکھ اور سکھ، خوشی اور غم، کلفت اور راحت، طمانیت اور پریشانی۔ سیری اور تشنگی۔ اس کے بارے میں شاعروں نے لکھا ہے۔ مفکّروں نے سر کھپایا ہے، عاشقوں نے تجربے کئے اور پروفیسروں نے مشاہدے کئے ہیں لیکن ابھی تک اس کی کوئی جامع اور تشفی بخش تعریف نہیں کی جا سکی۔ بلکہ اکثر اس کی مذمت ہی کی گئی ہے۔ ہاں، یہاں اتنا اعتراف ضرور کرلوں گا کہ ایک بار محبت کرتا ہوا میں پکڑا گیا۔ سزا کے طور پر مجھے شادی کے شکنجے میں جکڑ لیا گیا اور عمر قید کی سزا ملی جو میں نے بیوی کے نام منتقل کر دی۔

اب میں مانتا ہوں کہ عشق یقیناً دماغ کا خلل ہے (یہ شاید مجھ سے پہلے بھی کسی نے کہا تھا) اور اگر انسان کبھی ایسے خلل کا شکار نہ ہو

تو واقعی پاگل ہو جائے۔ دنیا ایسے پاگلوں سے بھری پڑی ہے۔ دماغ کے توازن کے لیے یہ خلل ضروری ہے۔

لکھنا، میں نے طالب علمی کے زمانے سے ہی شروع کیا تھا۔ یونیورسٹی میں بیک وقت انگریزی اور اردو میگزین کا ایڈیٹر رہا لیکن یونیورسٹی کے باہر صرف انگریزی میں ہی لکھتا تھا۔ ریڈیو کے ڈراموں میں بھی حصہ لیتا تھا۔ مضمون کے لیے پچیس روپے (جس میں سے چار آنے منی آرڈر فیس کے منہا کر لیے جاتے تھے) اور ایکٹنگ کے لیے پندرہ روپے ملتے تھے۔ حیدرآباد آنے سے اُردو انگریزی پر حاوی ہو گئی۔ اتنی کہ ہم نے انگریزی تقریباً چھوڑ ہی دی۔ اس طرح ہم نے وہ کام کر دکھایا ہے جو حکومت پچھلے چالیس سال سے کرنے کے لیے کوشاں ہے مگر ابھی تک نہیں کر پائی۔

میری پہلی کتاب "بند کواڑ" ۱۹۶۴ء میں شایع ہوئی۔ اس میں پانچ افسانے اور دس مزاحیہ مضمون تھے۔ اس کا مقدمہ عصمت چغتائی نے لکھا اور اس کی ایک کاپی میں نے قرۃ العین حیدر کو بھی بھیجی۔ وہ ان دنوں بمبئی میں مقیم تھیں۔ دو ماہ بعد جب میں انگلستان جا رہا تھا تو بمبئی میں اُن سے پہلی بار ملا۔ مجھے ان کا لکھنے کا انداز اور ادبی شعور بہت پسند ہے۔ انھوں نے مجھے صلاح دی کہ اگر میں طنز و مزاح کی طرف زیادہ دھیان دوں تو بہتر ہو گا، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں افسانے لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ خیر ایک تو میں اُن کی رائے کا احترام کرتا ہوں اور دوسرے مزاحیہ مضامین کے لیے فرمائشیں بھی آنے

لگیں۔ جہاں تک ایکٹنگ کا تعلق تھا۔ ریڈیو والوں نے مجھ سے کہا کہ چونکہ میں ایک اعلیٰ افسر ہوں اس لیے میرا ایرے غیرے ایکٹروں کے ساتھ ڈراموں میں حصہ لینا مناسب نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس اگر میں ان کے لیے کچھ لکھ سکوں تو وہ ممنون ہوں گے۔ اس طرح گویا تینوں طرف سے ایسا دباؤ پڑا کہ مجھے طنز و مزاح کے کٹہرے میں ڈال دیا گیا۔ ویسے میں افسانے اور سیریس مضامین بھی لکھنا پسند کرتا ہوں لیکن جب بھی کوئی موضوع ہاتھ میں لیتا ہوں تو خشونت سنگھ کی نصیحت یاد آجاتی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے دائرے پر اپنی توجہ مرکوز کرو۔ خیر چھوڑیئے اس بات کو۔ اردو میں دو کتابیں شایع ہوئی ہیں اور بے شمار مضامین اور چند کہانیاں رسالوں وغیرہ میں۔ میرے پاس چار پانچ کتابوں کا مواد موجود ہے جو مضامین، کہانیوں اور خاکوں کی شکل میں طبع یا براڈ کاسٹ ہو چکا ہے۔ کچھ مضامین کا ترجمہ، دوسری زبانوں میں بھی ہوا ہے۔ اڑیہ والوں نے تو پندرہ مضامین پر مشتمل ایک کتاب بھی شائع کر دی اور ـــــــــ "مزاح کا سمندر" کے لقب سے نوازا۔ ویسے رضاکارانہ طور پر کم لکھتا ہوں اگر کوئی ڈنڈا لے کر یا چیک دکھا کر لکھوائے تو پھر چار و ناچار بیٹھ جاتا ہوں۔

میں آرٹ میں صرف ایک ہی میڈیم سے مطمئن نہیں ہوں۔ کوئی بھی آرٹسٹ صرف ایک ہی میڈیم کے ذریعہ اپنے شدّتِ اظہار سے انصاف نہیں کر سکتا، اس لیے میں نے شاعری بھی شروع کی لیکن وہ آزاد، بلینک، ایبسرڈ ABSURD اور ایسا ہی کچھ بھی کہی جا سکتی ہے۔ کافی عرصے تک میں

انھیں سُنانے یا شایع کرنے سے جھجکتا رہا لیکن جب سُنایا یا چھپوایا تو اُسے کچھ قبولیت حاصل ہوئی اور اب کبھی کبھی شاعر کی حیثیت سے بھی مدعو کیا جاتا ہوں۔ ادب اور زندگی کے ہر دور میں متاخرین کی طے کی ہوئی تعریفوں اور مسلمات سے انحراف اور باندھی ہوئی حدوں کو توڑا جاتا ہے اس کے بغیر آرٹ میں روانی، بہاؤ اور پھیلاؤ نہیں آتا۔ انگریزی میں آگڈن ناش اور جاپان کی ہائیکو شاعری کا معترف اور معتقد ہوں۔ پینٹنگ اور موسیقی میں بھی دخل رکھنا چاہتا ہوں لیکن بچپن میں موسیقی کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا تھا کیونکہ میرا گرو خود نااہل تھا، تاہم مجھے صرف طبلہ سکھایا گیا لیکن طبلہ میں "سنگت" کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمیں یہ سنگت نصیب نہیں ہوئی۔ کوئی پچیس برس تک طبلوں کی ایک جوڑی ہماری بے التفاتی کے باوجود ہمارے ساتھ بھٹکتی رہی۔ دو سال ہوئے میری بیوی نے اس کو بیچ کر تیس روپے کما لیے اس طرح سنگت کا سکوپ بھی ختم ہوا۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ کوئی بھی آرٹسٹ اپنے اظہارِ خیال کے لیے صرف ایک میڈیم سے مطمئن نہیں رہ سکتا۔ عذرا پاونڈ نے کیا خوب کہا ہے کہ تخلیقی تحریک مختلف ذرایع سے ظہور میں آسکتی ہے۔ ایک ہی فن کار کا وجدان لفظوں میں، رنگ میں، بُت تراشی میں، موسیقی میں، رقص یا شاعری میں آشکار ہو جاتا ہے۔ 'فارم' کا انحصار اس بات پر ہے کہ فن کار کا تصوّر یا جذبہ اُس کے شعور میں کس روپ سے ابھرا..... یہ کیا؟ یہ مزاح نگار' تو بہت سیریس ہوتا جا رہا ہے۔ معاف کیجیے، ذرا بہک گیا تھا۔ اس

بحث کو یہیں ختم کرتے ہیں ۔ میں صرف یہی کہنا چاہتا تھا کہ میں صرف طنز و مزاح کا ادیب ہی ہونے پر مطمئن نہیں بلکہ چاہتا ہوں کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے اُس کا اظہار کبھی پینٹنگ میں، کبھی بُت تراشی میں اور کبھی دوسرے فنونِ لطیفہ کے ذریعہ کر سکوں ۔ لیکن انسان کی زندگی اتنی مختصر ہے کہ وہ ایک فن پر بھی عبور حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں اور پھر خشونت سنگھ کی نصیحت کہ ......

موت کا خیال مجھے بارہا آتا ہے۔ کبھی کبھی خودکشی کا خیال بھی آتا ہے ایسے خیال کیوں آتے ہیں؟ اس کے بارے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بظاہر میں خوشحال ہوں۔ کوئی ایسی دماغی بیماری بھی نہیں، غموں کا کوٹہ بھی مجھے اوسط سے قدرے کم ہی ملا ہے۔ پھر بھی میں نے موت اور اس کے تصوّر سے اکثر محبّت کی ہے۔ زندگی اور موت دونوں سے یکساں طور پر محبّت کرتا ہوں اور ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا کہ کس کے ساتھ نباہ کروں لیکن مجھے معلوم ہے کہ موت صابر اور جابر معشوق ہے۔ وہ میرا انتظار کرے گی اور ایک دن یقیناً لذّتِ وصل سے سیر ہوگی۔ تب تک میں خود بھی ہنستا اور دوسروں کو ہنساتا اور رُلاتا رہوں گا۔ زندگی میں انسان اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا ہے؟

[یہ خودنوشت اڈیہ کی کتاب "نریندر لوتھر کے بہترین مضامین" کے لیے مئی 1984ء میں لکھی گئی]

حیدرآباد کا تغرافیہ

تغرافیہ ایک نئی اصطلاح ہے جو تاریخ اور جغرافیہ کو ملا کر بنائی گئی ہے۔ اس کے تحت تاریخ و جغرافیہ کے علاوہ تہذیب و تمدن اور سیاسی و اقتصادی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ طویل عرصہ سے حیدر آباد پر ایک جامع اور مستند مضمون کی کمی محسوس کی جارہی تھی۔ یہ مضمون اِس اُمید کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ اس کو پڑھ کر یہ کمی اور بھی شدت کے ساتھ محسوس کی جائے گی!

حیدرآباد اصل میں ایک مونث بستی تھی جو بعد میں مذکر شہر بن گیا۔ اس کا اصلی نام "بھاگیہ نگر" تھا۔ جب اس کی سیکس بدلی تو یہ حیدرآباد بن گیا —— اس طرح جنس کی اس پیمانہ پر تبدیلی کا معجزہ پہلی بار یہیں ہوا۔ آج کل کے اچھے سائنسداں اکّے دکّے کیس میں سیکس بدل کر اپنے آپ کو بڑے تیس مار خاں سمجھتے ہیں۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ صدیوں پہلے ہندوستان میں ایک پورے شہر کی سیکس بدل دی گئی تھی۔ یہاں کے لوگوں کو اب بھی یہی خدشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں دوبارہ پھر ویسی ہی تبدیلی نہ واقع ہوجائے۔ اس لیے وہ کسی قسم کے جنسی تذکرے سے احتراز کرتے ہیں۔ آپ

نے یہ بھی نوٹ کیا ہوگا کہ یہاں کے پُرانے خاندانوں کی بیگمات اور امیرزادیاں ابھی تک اپنے آپ کو جنسِ مذکر مان کر بات کرتی ہیں مثلاً "میں وہاں گیا"..."میں آپ کو کھاؤں گا" وغیرہ وغیرہ۔

حیدرآباد بہت خوب صورت شہر ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس کو لاثانی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس نام کا ایک اور شہر پاکستان کے صوبۂ سندھ میں بھی واقع ہے۔ آزادی سے پہلے جب سندھ، ہندوستان کا ایک صوبہ تھا۔ ان دونوں شہروں میں امتیاز کرنے کے لیے ہمارے شہر کو دکن کا تخلص دیا گیا تھا۔ (اس کے سود مند نتائج کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے) تقسیمِ ہند سے پہلے اِن دونوں شہروں میں کافی کنفیوژن (CONFUSION) رہتا تھا۔ اکثر مسافر حیدرآباد سندھ کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھتے تو حیدرآباد دکن آپہنچتے مشہور شاعر جوشؔ ملیح آبادی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ (نتیجتاً وہ بے چارے دس پندرہ سال کی تاخیر کے بعد اپنی منزلِ مقصود تک پہنچے)۔ اس افراتفری سے بچنے کے لیے تقسیمِ ہند کے وقت سندھی حیدرآباد پاکستان کو دے دیا گیا اور اُس کے بدلے کچھ سندھیوں کو لے لیا گیا۔

اس امر کے بارے میں اختلاف رائے ہے کہ یہ حیدرآباد پہلے قائم ہوا یا سندھ کا حیدرآباد۔ اب چونکہ وہ حیدرآباد ہمارے ملک میں نہیں اس لیے ہمیں یہ کہنے میں کوئی گریز نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ حیدرآباد پُرانا ہے اور ہمارا حیدرآباد نیا۔ اس لیے یہ زیادہ خوبصورت بھی ہے۔ کئی مورخین کی رائے ہے کہ بانیٔ شہر محمد قلی قطب شاہ نے اپنے ماہر معماروں کو ڈیپوٹیشن پر سندھ بھیجا تاکہ وہ وہاں کے حیدرآباد کا بغور مطالعہ کرکے یہاں کے لیے ایک ایسے شہر کا منصوبہ بنائیں جس میں اُس شہر کی کوئی بھی خامی نہ ہو۔ ان ماہروں کو یہاں کے لیے نئی خامیوں کی تلاش میں کافی محنت کرنی پڑی۔ اس محنت کے

صلے میں ان کو ڈبل "ٹی اے" اور "ڈی اے" منظور کیا گیا۔

محمد قلی قطب شاہ کو عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ ایک بار جب وہ دلی گیا تو شوق شوق میں اس نے ایک بہت اونچا مینار بنوا دیا جسے آج کل قطب مینار کہتے ہیں۔ جب یہاں کی رعایا کو یہ بات معلوم ہوئی تو اُن میں غیض و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی کہ اپنے شہر کو چھوڑ کر دلی میں مینار بنوانے کا کیا مطلب۔ بادشاہ نے دلی والے آرکیٹکٹ کو بُلا کر اُسے بھی ویسا ہی مینار بنانے کو کہا۔ لیکن قطب مینار بناتے بناتے وہ آرکیٹکٹ بے چارہ بوڑھا ہو گیا تھا اور اب اس میں اس بلندی پر پہنچنے کی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ جب اس نے اپنی معذوری ظاہر کی تو بادشاہ نے کہا ۔۔ کوئی مضائقہ نہیں، تم چار چھوٹے چھوٹے مینار بنا دو، ہم کسی اور نوجوان آرکیٹکٹ کو کہہ دیں گے کہ وہ ان کو ایک دوسرے کے اوپر کھڑا کر کے ایک اونچا مینار تیار کر دے۔ جب چاروں مینار علٰحدہ علٰحدہ تیار ہو گئے تو ایک مدّبر نے صلاح دی کہ عالم پناہ آپ کیوں نہ چار مینار علٰحدہ علٰحدہ ہی رہنے دیں۔ اس طرح آپ رعایا کو کہہ سکتے ہیں کہ اگر آپ نے دلی میں ایک مینار بنوایا تو یہاں کے لوگوں کے لیے چار مینار بنوائے اس کے علاوہ آپ کے نام کے چار حصوں یعنی محمد قلی قطب اور شاہ کے لیے ایک ایک مینار یادگار رہے گا۔ بادشاہ کو یہ صلاح پسند آئی اس سے نہ صرف فوری طور پر اس کی شخصیت کو چار چاند بلکہ چار مینار لگ گئے اور ہمیشہ کے لیے اس کا نام امر ہو جانے کا امکان پیدا ہو گیا۔ اس مُدّبر کو ایسی صلاح دینے کی پاداش میں پدما بھوشن کے خطاب سے نوازا گیا اور اس طرح حیدر آباد کا امتیازی نشان وجود میں آیا۔

چار مینار کی دھوم جب دلی تک پہنچی تو مغل بادشاہ اورنگ زیب کے دل

میں اسے دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے جب دکن کے دورہ کا پروگرام بنایا تو اس کا سپہ سالار اور فوج کے ہزاروں سپاہی سیاحت کے شوق میں اُس کے ساتھ ہو لئے۔ یہاں ٹورسٹ لوگوں کا رش اتنا تھا کہ اورنگ زیب کو چھ مہینے انتظار کرنا پڑا۔ بے تاب ہو کر اس نے شہر پر دھاوا بول دیا۔ یہ عمارت دیکھی تو اتنی پسند آئی کہ سات سال تک یہیں ٹکا رہا۔ آخر چارمینار کی تصویر دل میں لیے وہ دکن میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔

مغلوں کے صوبہ دار آصف جاہ نے خود مختاری کا اعلان کر کے یہاں آصف جاہی خاندان کی بنیاد رکھی لیکن مغلوں کے تئیں وفاداری دکھانے کے لیے اس نے اپنا لقب نظام ہی رکھا۔ دیسی ریاستوں کے راجاؤں اور نوابوں کو انگریزی سرکار نے ہز ہائی نس کے خطاب سے نوازا تھا لیکن چونکہ حیدرآباد سطح مرتفع ہے اور یہاں کی سطح دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں اونچی یعنی اگزالٹیڈ ہے اس لیے نظام کو محض جغرافیہ کی بناء پر ہز اگزالٹیڈ ہائی نس کا خطاب دیا گیا تھا۔

یہاں کے ایک نظام نے عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ اس یونیورسٹی کی خاص خوبی یہ تھی کہ یہاں کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا اور اردو کے علاوہ باقی تمام مضامین اُردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ جب اردو کے طلباء نے ایجی ٹیشن کیا کہ انہیں بھی اس زبان میں تعلیم حاصل ہونی چاہیئے تو حکومت نے ذریعہ تعلیم بدل کر انگریزی کر دیا یہاں کے پُرانے طلباء آج تک انگریزی بھی اُردو میں بولتے ہیں۔ آج کل اس یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم ایجی ٹیشن ہے اور ہر مضمون اس کے ذریعہ پڑھایا جاتا ہے دُور دراز سے طلباء یہاں یہ مضمون پڑھنے آتے ہیں۔

حیدرآباد میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن سمجھی کوئی نہیں جاتی۔ یہ اس لیے کہ

ہر زبان میں دوسری زبانوں کا رنگ زیادہ ہے مثلاً تلگو میں اردو اور مراٹھی کے الفاظ کی بھرمار ہے اور اردو میں کنڑا، تلنگی اور مراٹھی اصطلاحوں کی بہتات ہے۔ اس لیے یہاں ایک زبان سمجھنے کے لیے تین زبانوں میں مہارت لازمی ہے۔ اس حساب سے ظاہر ہے کہ تینوں زبانوں کو جاننے کے لیے نو زبانوں پر عبور کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے لوگوں کا خیال ہے کہ اس ریاست کو دو حصّوں میں بانٹ دینا چاہیئے۔ یک میں تلگو زبان رائج ہوگی اور دوسرے میں تلگو۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ سندھی حیدرآباد سے امتیاز کرنے کے لیے اس شہر کو دکن کا تخلص دیا گیا تھا۔ اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ یہاں بے شمار شاعر پیدا ہوگئے حیدرآباد کا بانی محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ اس نے اتنے شعر کہے ہیں کہ اس کو ایک تخلص کافی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے تین تخلص رکھے۔ قطبؔ شاہ، معانیؔ اور ترکمانؔ۔ اس کے بعد روایتاً ہر بادشاہ کو شعر کہنا لازمی ہو گیا لیکن ان بادشاہوں کی شاعری میں وہ بات نہیں جو قلی میں ہے وہ بادشاہ چونکہ اصلاً قُلی تھا اس لیے اس کی شاعری غریبوں، مزدوروں اور قلیوں کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ اُس کی زیادہ تر شاعری پنجابی میں ہے۔ اس طرح اس نے طبقاتی لسانی اور علاقائی رواداری کی بنیاد رکھی۔ آج کل اس کی شاعری کو یہاں کوئی نہیں سمجھتا۔

حیدرآباد نے بہت بڑے بڑے شاعر اور ادیب پیدا کئے ہیں لیکن ان میں سے کوئی لافانی نہیں ہو سکا کیوں کہ یکے بعد دیگرے سب مر گئے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہاں کی مِٹّی میں کچھ ایسی بات ہے کہ جو شاعر اور ادیب یہاں پیدا ہوتا ہے وہ ایک نہ ایک دن مر جاتا ہے۔ اس لیے کئی شاعر یہاں سے ہجرت کر گئے

اب جب کہ اس شہر کا تخلص منسوخ کر دیا گیا ہے۔ شاعری کو بھی کافی نقصان پہنچا ہے تاہم دکنی شاعری اب بھی بہت مقبول ہے اور مشاعرے اب بھی بہت کامیاب رہتے ہیں۔ جب بھی شکیلہ بانو بھوپالی دوسرے شعرا کا کلام پیش کرتی ہے تو بے پناہ ہجوم ہوتا ہے۔

اب یہاں کے جغرافیہ کے بارے میں چند اہم معلومات پیش ہیں۔ حیدرآباد کا محل وقوع بہت ہی عمدہ ہے۔ ایک طرف شمال، دوسری طرف مشرق تیسری طرف مغرب اور چوتھی طرف جنوب ہے۔ سب سے زیادہ جنوب ہے اس لئے بھی اسے دکن کہا جاتا ہے۔ "وقوع" کے مقابلہ میں یہاں محل زیادہ ہیں۔ محلاتِ شاہی میں چار محل، چو محلہ اور فلک نما محل زیادہ مشہور ہیں۔ عموماً شہر دریا کے کنارے واقع ہوتے ہیں۔ اس روایت کو پیشِ نظر رکھ کر اس شہر کے کنارے ایک دریا بہانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کو موسیٰ ندی کہا جاتا ہے۔ یہ دریا ابھی تک پوری طرح آباد نہیں ہوا۔ اس میں پانی برائے نام ہے اور چٹانوں، کائی اور گھاس کی بھرمار ہے۔ چٹانوں کو توڑنے کا ٹھیکہ دھوبیوں کو دیا گیا ہے جو انہیں کپڑوں سے توڑتے ہیں۔ کپڑے سکھانے کی سہولت کے لئے دریا پر جا بجا پُل بنائے گئے ہیں۔ ایک پُل پر صرف چادریں سکھائی جاتی ہیں۔ اس کا نام چادر گھاٹ پُل ہے۔ اس طرح پُرانے پُل پر پُرانے کپڑے سکھائے جاتے ہیں اور نئے پُل پر صرف ٹیری لین کے نئے کپڑے۔ مُسلم جنگ پُل پر ایکس سروس مین مُسلمان سکھائے جاتے ہیں۔ یہ نام نہاد دریا پچاس سال میں صرف ایک بار دریا بنتا ہے۔ باقی وقت دھوبی گھاٹ کا کام دیتا ہے۔ جب یہ دریا بنتا ہے تو بڑا غضب ڈھاتا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں اور پھر ایک بار ۱۹۷۰ء میں اس کے پانی سے بہت تباہی آئی تھی۔ اب امید ہے کہ اِس صدی کی طغیانیوں

کا کوٹا پورا ہو گیا ہو گا۔

دریا کے ایک کنارے پر ہسپتال ہے اور دوسرے کنارے پہ ہائی کورٹ۔ فوجداری کیسوں کے شکاروں کو پہلے ہسپتال کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ علاج معالجہ کے بعد عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر وہ ان دونوں جگہوں سے زندہ بچ جائیں تو انہیں جیل بھیج دیا جاتا ہے جو ہائی کورٹ سے تھوڑے فاصلہ پر واقعہ ہے۔

یہاں کے بازار اور سڑکیں کشادہ ہیں۔ مرکزی شاہراہ اتنی لمبی ہے کہ اس کے ایک ایک حصہ کا علٰحدہ علٰحدہ نام رکھا گیا ہے۔

چارمینار کے پاس اس کا نام پتھرگٹی ہے۔ دریا پار کر کے اس کا نام افضل گنج اور عثمان گنج بن جاتا ہے۔ معظم جاہی مارکٹ کے بعد وہ جواہر لال نہرو سڑک بن جاتی ہے۔ اس کے بعد عابد روڈ، بشیر باغ، پھر کنٹہ حسین ساگر وہاں پہنچ کر ایک شاخ مہاتما گاندھی بن جاتی ہے اور دوسری راشٹرپتی۔ راشٹرپتی سے بچ کر جو حصہ سکندرآباد کی چھاؤنی میں داخل ہوتا ہے اُسے بریگیڈیر سعید کی وردی پہننا پڑتی ہے۔ اس کے بعد سُنا ہے کہ وہ سڑک نظام آباد چلی جاتی ہے لیکن میں کئی بار اس سڑک پر گیا ہوں۔ میں نے تو اسے کہیں بھی جاتے نہیں دیکھا۔ وہیں کی وہیں پڑی ہے۔ اس شاہراہ کے علاوہ بے شمار اور سڑکیں ہیں لیکن فی الوقت ہمارے پاس ان کے نام لکھنے کی گنجائش نہیں۔ مرکزی شاہراہ اتنی کشادہ ہے کہ دس رکشا بازو بازو چل سکتے ہیں اور پھر بھی بس کے لئے جگہ رہ جاتی ہے۔ یہاں کی رکشا بہت چھوٹی اور بسیں بہت لمبی اور اونچی ہوتی ہیں۔

حیدرآباد کی روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی آدھی بسوں کے انجن چوری ہو گئے

ہیں۔ اس لیے ان کو دوسری بسوں کے پیچھے باندھ کر چلایا جاتا ہے۔ کئی بار پچھلی بندھی ہوئی بسوں نے بور ہو کر بندھن تڑوا کر بھاگنے کی بھی کوشش کی ہے۔ دو منزلہ بسیں یہاں بہت عام ہیں۔ یہاں کی بسوں کی دو خوبیاں ہیں۔ دو منزلوں میں سے ایک منزل کے مسافر فری سفر کرتے ہیں۔ بسوں کے رُکنے کا سسٹم مسافر کی صحت کی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر بنایا گیا ہے۔ روڈ کارپوریشن نے جگہ جگہ اسٹانڈ بنائے ہیں۔ ان کو کہا تو جاتا ہے بس اسٹانڈ لیکن یہ ہوتے اصل میں پبلک اسٹانڈ ہیں۔ لوگ یہاں کھڑے رہتے ہیں۔ بس یا تو اس سے کچھ پہلے یا، اس سے کچھ فاصلہ آگے رکتی ہے مسافروں کو وہاں تک بھاگ کر بس پکڑنا پڑتی ہے۔ اس جبری کسرت کی وجہ سے حیدر آباد کی جنتا کی صحت دوسرے شہروں کے رہنے والوں سے بہتر ہے۔ کرایہ دینے کے بھی یہاں دو سسٹم ہیں۔ اگر آپ ٹکٹ خریدنا چاہتے ہیں تو کرایہ پورا لگتا ہے۔ اگر آپ ٹکٹ خریدنے پر اصرار نہ کریں تو آپ آدھے کرائے پر ہی سفر کر سکتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ اس سے کمپنی کا ٹکٹیں چھپوانے کا خرچ بچتا ہے۔ چھوٹا موٹا چینج کنڈکٹر خود ہی "ٹپ" کے طور پر رکھ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کا بس سسٹم ہندوستان میں سب سے زیادہ "انفارمل" اور سستا ہے۔ یہاں کی بسیں بہت دندناکر چلتی ہیں اور خوب دھواں چھوڑتی ہیں۔ اس سے کم بینائی اور اونچا سننے والے لوگوں کو بھی پتہ چل جاتا ہے کہ بس کدھر اور کب گئی۔ اب چونکہ بسوں پر رش اور بھی بڑھ رہی ہے اس لیے تجویز ہے کہ تین یا چار منزلہ بسیں بنائی جائیں۔ اس سے سفر اور بھی سستا ہو جائے گا۔

حیدر آباد کے مختلف محلوں کے نام جسم کے حصّوں یا بیماریوں پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً امیر پیٹ، بیگم پیٹ، رحیم پیٹ وغیرہ۔ بلغم پیٹ بھی ایک محلہ کا نام

ہے۔ نئی آبادیوں کے نام جسم کے اور دوسرے حصّوں کے ناموں پر رکھے جائیں گے۔

کچھ اور نام مندرجہ ذیل ہیں۔

ماما جمیلہ کی دیوڑھی، چیلہ پورہ، گھاسی میاں بازار، کوکا کی ٹٹی، گھوڑے کی قبر، زچہ کی قبر، سلیمان جاہ کی چاوڑی۔ چوک مرغاں۔ شہر کے اطراف کئی خوبصورت جھیلیں ہیں۔ ایک جھیل حیدرآباد اور سکندرآباد کے درمیان واقع ہے۔ ان جھیلوں کو ساگر کہا جاتا ہے، یہاں امرود کو جام کہتے ہیں۔ روایت ہے کہ امرود کھا کر اگر کسی جھیل کا پانی پی لیا جائے تو وہی نشہ چڑھتا ہے جو جام نوش کرنے پر آتا ہے۔

اب ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ حیدرآباد دراصل دو شہر ہیں۔ ایک حصّہ کا نام حیدرآباد اور دوسرے کا نام سکندرآباد۔ دونوں کو جڑواں شہر بھی کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے سکندرآباد، سکندر اعظم کے نام پر آباد ہوا تھا۔ سکندر ہندوستان کا پہلا یوروپین حملہ آور تھا۔ پورس سے لڑائی کے بعد وہ حیدرآباد آیا۔ یہاں اس نے یونانی دواخانے کا سنگِ بنیاد رکھا اور اس کے لئے یونانی اکسپرٹ اور فارین ایڈ دینے کا وعدہ کیا یہ دواخانہ اب بھی چارمینار کے بازو قائم ہے۔ سنگِ بنیاد کی رسم کے بعد سکندر اعظم کے اعزاز میں پریڈ گراونڈ میں شاندار پریڈ ہوئی اور ساتھ ہی اس شہر کا نام سکندرآباد رکھا گیا۔ یونانی فاتح بجائے خوش ہونے کے معترض ہوا کہ اس کا پورا نام سکندر اعظم ہے اور شہر کا نام صرف سکندرآباد رکھا گیا ہے۔ اس کمی کی تلافی کے لئے فیصلہ ہوا کہ حملہ آور کے خطاب پر ایک محلہ کا نام اعظم پورہ رکھ دیا جائے۔ تب کہیں جا کر ہمارے معزز حملہ آور کی تسلی ہوئی اور وہ یہاں سے واپس چلا گیا۔ اُس دن سے آج تک اُس آمد کی یادگار میں سکندرآباد پریڈ گراونڈ پہ ہر سال دو بار پریڈ ہوتی ہے۔ ایک گرمیوں میں اور ایک سردیوں میں۔

ان جڑواں شہروں کی آبادی تقریباً (۲۰) لاکھ ہے۔ پچھلی مردم شماری کے اعداد وشمار کے مطابق غیر شادی شدہ طبقے میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے پچاس سالوں میں عورتوں کی شادیاں زیادہ ہوئی ہیں۔ اب حیدرآباد کے نئے کلکٹر نے احکام جاری کردیئے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو عورتوں اور مردوں کی شادیاں بیک وقت ہوں۔ اس سے خرچ میں بھی بچت ہوگی اور توقع کی جاتی ہے کہ اگلی مردم شماری تک دونوں کی تعداد میں توازن پیدا ہوجائے گا۔

حیدرآباد کی آب وہوا اور غذا میں ایک خاص اثر پایا جاتا ہے جس سے یہاں کے لوگوں کی یادداشت کمزور ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے ماضی کے بارے میں صرف کل اور پرسوں تک ہی یاد رکھ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے کے واقعات پرسوں تک ہی منجمد ہوکر رہ جاتے ہیں۔ کوئی واقعہ دو دن پہلے ہوا ہو یا پچاس سال پہلے پرسوں کی بات ہی کہا جاتا ہے۔ اکثر بزرگ ۱۹۰۸ء کی باڑھ کو بھی پرسوں کی طغیانی کہتے ہیں۔

یہاں کے لوگ بڑے ملنسار اور خوش طبع ہیں۔ برتاؤ میں بڑے سلیقہ شعار ہیں۔ ایسے لوگ گورنر اچھے بنتے ہیں۔ اس لیے یہاں کے کئی معزز شہری گورنر بناکر دوسرے صوبوں کو برآمد کئے جاتے ہیں۔ سروجنی نائیڈو، پدمجا نائیڈو، رام کرشنا راؤ، سری نگیش، علی یاور جنگ، گوپال ریڈی اور اکبر علی خاں یہیں سے گورنر بن کر گئے۔ یہاں کے بنائے ہوئے گورنر اترپردیش میں خاص طور پر پسند کئے جاتے ہیں۔

حیدرآباد جو بھی آتا ہے اسے اپنا لیتا ہے۔ یہاں کی مٹی ہر شخص کو اپنے وطن کی مٹی لگتی ہے۔ اس لیے یہاں ہندوستان کے ہر کونے سے بلکہ دوسرے ممالک سے بھی لوگ آکر بس گئے ہیں اور جانے کا نام تک نہیں لیتے۔ جنوب کے لوگ اسے حدِ جنوب مانتے ہیں۔ شمال کے لوگ اسے خطۂ شمال سمجھتے ہیں

یہاں کے پُرانے شہر میں بغداد اور بصرہ کا ماحول ملتا ہے۔ سکندرآباد کی چھاؤنی پر اینگلو انڈین چھاپ ہے۔ کافی ہاؤس پال گھاٹ کے لوگ چلاتے ہیں۔ چائے خانے ایرانیوں کے مونوپلی ہیں۔ ویجیٹرین ہوٹل کے اکسپرٹ منگلور کے برہمن ہیں۔ بزنس میں مارواڑی اور سندھی پیش پیش ہیں۔ ہندو مُسلم سکھ عیسائی پارسی یہودی ہر قسم کے لوگ ہر موسم میں پائے جاتے ہیں۔ یہ شائد اسی مذہبی علاقائی اور تہذیبی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے کہ یہاں زیادہ تر موسم خوشگوار اور معتدل ہوتا ہے۔ ویسے یہاں گرمیوں میں کڑاکے کی گرمی پڑتی ہے۔ سردیوں میں سردی بھی خوب ہو جاتی ہے۔ برسات کے موسم میں جھڑی بھی اچھی لگتی ہے۔ باقی سال موسم معتدل رہتا ہے۔

حیدرآباد چھوٹے پیمانے پر ہندوستان کی تصویر ہے۔ ہمارے ملک کی طرح اس شہر میں بھی کثرت میں وحدت پائی جاتی ہے۔ یہ شہر بھی ہمارے ملک کی طرح گلہائے رنگارنگ کا گلدستہ ہے جس کی مہک سے سارا چمن معطر ہے۔

اگر حیدرآباد جیسے آٹھ دس اور شہر ہندوستان میں آباد ہو جائیں تو یہ ملک رشکِ جنّت ہو جائے گا۔

سُنا ہے کہ پانچویں پنجسالہ منصوبے کے لیے یہ تجویز زیرِ غور ہے۔

■■

بننا ہمارا صدرِ جلسہ

ایک زمانہ تھا، جب کہ چند منتخب اشخاص کو ہی کسی جلسہ یا محفل کی صدارت کا موقع ملتا تھا۔ آزادی کے بعد ایسے مواقع عام لوگوں کو بھی فراہم ہونے لگے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ جتنا زیادہ کوئی ملک ترقی یافتہ ہوگا اسی تناسب سے وہاں جلسے ہوں گے۔ ہندستان نے آزادی کے بعد بہت ترقی کی ہے اور اس ترقی کا اندازہ ہمارے جلسوں کی کثرت سے بھی لگ سکتا ہے۔ ظاہر ہے فی جلسہ کم از کم ایک صدر تو ہونا لازمی ہے۔ بلکہ آج کل تو ایسا جلسہ جس میں صرف صدر ہی ہو بڑی گھٹیا قسم کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ معیاری جلسوں میں ایک صدر، ایک مہمانِ خصوصی، ایک کلیدی مُقرِّر اور دو تین عام مقرّر ہونا لازم ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ سوائے کلیدی مقرر کے کسی اور کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کوئی کام کی بات کرے۔ کلیدی مقرر کو سب سے لمبی تقریر کرنی پڑتی ہے۔

جلسے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے موقع محل کی قید نہیں۔ موقع چاہے خوشی کا ہو۔ چاہے غمی کا، اس کے لیۓ جلسہ ہونا ضروری ہے۔ تہنیتی جلسہ، تعزیتی جلسہ،

خیر مقدمی جلسہ ، وداعی جلسہ ، خوش آمدیدی جلسہ ، گلپوشی کا جلسہ ، ترقی کا جلسہ ، تنزلی کا جلسہ وغیرہ - یہ تو شخصی نوعیت کے جلسے ہیں۔ ایک زمرہ ایسے جلسوں کا ہے جو اداروں سے تعلق رکھتے ہیں ۔ افتتاحیہ جلسہ ، اختتامیہ ، جوبلی جلسہ (پیتل سے زمرّد تک) فلم کی مہورت کا جلسہ ، نمائش کے آغاز کا جلسہ ۔ سو دن بغیر شور شرابے کے مکمل کرنے کا جلسہ ، حسینۂ سال کے انتخاب سے لے کر کتوّں کے مقابلہ تک کے جلسے برپا ہوتے ہیں ۔ اب صرف "بلیوں کے شو" کا جلسہ منعقد کرنے کی کسر رہ گئی ہے۔ جلسوں کا انحصار آب و ہوا پر بھی ہوتا ہے۔ ٹھنڈے ملکوں میں جلسے کم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ لوگ اپنے گھروں میں سُکڑے رہتے ہیں ۔ لیکن گرم ملکوں میں لوگ گرمی کی وجہ سے پھیل کر باہر نکل پڑتے ہیں اس لیے زیادہ جلسے منعقد کئے جلتے ہیں ۔

جلسوں کی فراوانی ہو تو ظاہر ہے کسی نہ کسی دن صدارت کا قرعہ کسی کے نام بھی اُٹھ سکتا ہے ۔ ایک سہانی صبح یہ مصیبت ہم پر بھی نازل ہو گئی ۔ مصیبت ہم اس وقت کہہ رہے ہیں ۔ جب صدارت کی پیشکش ہوئی تھی اُس وقت ایسا نہیں لگا تھا ۔

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ صبح یا دوپہر کا وقت تھا ۔ آفتاب چمک رہا تھا ۔ لیکن ہمارے ایر کنڈیشنر کی آواز کی وجہ سے دھوپ کمرے کے اندر آنے سے ڈر رہی تھی ۔ ممکن ہو کہ شام ہو اور سورج غروب ہونے والا ہو ۔ ایر کنڈیشنڈ کمرے کا یہی نقصان ہوتا ہے ۔ کچھ پتہ نہیں لگتا کہ باہر کیا ہو رہا ہے ۔ اس لیے ہمیں یہ نہ پتہ چل سکا کہ کمرے کے باہر ہمارے خلاف ایک خطرناک سازش ہو رہی تھی ۔ سازشی گروہ اندر آیا اور ہم سے بڑے تپاک سے ملا ۔ اِدھر اُدھر کی باتیں

ہوئیں۔ موسم کا چرچا ہوا۔ ہاں ہمیں اب یاد آیا کہ اس وقت یقیناً دوپہر تھی کیونکہ ان لوگوں نے ہمیں بتایا تھا کہ باہر بہت گرمی ہے۔ ہم نے ان کو گرم پانی پلایا کیونکہ سخت گرمی سے ٹھنڈے مقام پر آکر ٹھنڈا پانی پینے سے پانی کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور اس سے کئی قسم کی بیماریاں پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے اور ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہماری تواضع سے شہر میں کوئی وبا پھوٹ پڑے۔

ان میں سے ایک صاحب گویا ہوئے کہ ایک آل انڈیا ادبی جلسہ ہو رہا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ ایک باادب شخص کو اس جلسہ کی صدارت پیش کی جائے۔

ہم نے کہا کہ ایسا آدمی ڈھونڈنا مشکل ہے لیکن ہمارا دفعدار بہت باادب شخص ہے۔ اور وہ یقیناً اپنی قسم کے اور بھی لوگوں کو جانتا ہوگا۔ یہ کہہ کر ہم نے اسے بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔

ڈیلی گیشن کے لیڈر نے ہم کو روکا اور کہا نہیں صاحب یہ دفعدار آپ کے سامنے بے شک باادب ہو لیکن آپ کی غیر موجودگی میں بہت بے ادب ہو جاتا ہے۔

ہم نے کہا تو پھر ہم بھی جلسہ میں شرکت کریں گے تاکہ وہ باادب رہے۔ لیڈر نے کہا بے شک آپ اسے ساتھ لے آئیں لیکن جلسہ کی صدارت آپ کو کرنا ہوگی۔ ہم نے لاکھ عذر کئے لیکن اُن کا فیصلہ اٹل تھا۔ آخر ہم سے دن اور وقت کی بات پکی کر کے وہ چلے گئے۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ ایک ممتاز لیڈر مہمان خصوصی ہوں گے اور یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کلیدی خطبہ پڑھیں گے۔ ہم نے پوچھا کہ مہمان خصوصی کوئی صاحب ہوں گے اور کلیدی خطبہ کوئی اور صاحب دیں تو اس ڈیویژن آف لیبر میں ہمارا مالِ غنیمت کیا ہوگا۔ جواب :۔ آپ صدارتی ایڈریس پڑھیں گے۔ موضوع تھا "دوسری جنگ عظیم کی تاریخ اور اس کے نتائج"۔

ایک ہفتہ کا وقفہ آہستہ آہستہ گزر گیا اور وہ منحوس دن آن پہنچا جب ہمیں صدر بننا تھا ہمیں پابندیٔ وقت کی بڑی عادت ہے حالانکہ ایک طویل عرصہ سے ہم ریڈیو اسٹیشن جاتے ہیں پھر بھی یہ عادت نہیں چھٹ سکی۔ حیدرآباد میں اور خاص کر اردو کے تعلق سے جو جلسے ہوتے ہیں وہ اتنی تاخیر سے شروع ہوتے ہیں کہ ہماری بیگم بھی تیار ہو کر وقت پر پہنچ جاتی ہیں۔ لیکن ہماری یہ دیرینہ خواہش تھی کہ اگر کبھی ہمارا بس چلے تو جلسے وقت پر شروع کروادیں اور لوگوں کو ایک بار یہ جتلادیں کہ پابندیٔ وقت کتنی اہم بات ہے۔ اب ہمیں یہ موقع ملا تھا کہ وقت کی قیمت کا اندازہ لوگوں کو دلائیں۔

ہم نے جلسہ سے ایک دن پہلے اپنے ڈرائیور کو ہدایت دی تھی کہ تم پندرہ بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلاکر دیکھو کہ ہمارے گھر سے جلسہ گاہ تک کتنا وقت لگتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم نے ستائیس منٹ کا وقت سفر کے لئے رکھا تھا۔ اب شومیٔ قسمت کہ ہمارا ڈرائیور اس دن بیمار ہو گیا اور اس کی جگہ ایک دوسرا ڈرائیور آ گیا۔

کنٹہ میر جملہ کے پاس ڈرائیور نے گاڑی روکی اور ہماری طرف دیکھ کر پوچھا کہ صاحب کدھر جانا ہے۔

ہمیں بڑا غصہ آیا۔ جلسہ گاہ جانا ہے اور کہاں جانا ہے۔ ڈرائیور نے کہا حضور ہمیں تو صرف یہ بتایا گیا تھا کہ کنٹہ میر جملہ کی مغربی جانب پہنچ جانا۔ یہ وہی جگہ ہے یہاں جلسہ کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ ہم نے ٹینک کے اطراف چکر لگائے۔ ایک جگہ کچھ جھنڈیاں لگی ہوئی نظر آئیں۔ ہم نے سوچا یہی جلسے کا مقام ہوگا۔ گاڑی چلاکر وہاں پہنچے تو ایک عمر رسیدہ بزرگ روک کر بولے صاحب شادی کل تھی۔ بڑی پریشانی

ہوئی۔ پھر ہم نے سوچا کہ تھوڑی دیر ٹہل لیں۔ ہو سکتا ہے کہ منتظمین بھی ہمیں ڈھونڈ رہے ہوں۔

ہماری شکل سے پریشانی کا اظہار یقیناً ہو رہا ہوگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک فقیر جو کافی دیر سے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا اور جس کی نظروں سے ہم اپنی آنکھ بچانے کی کوشش کر رہے تھے، ہماری طرف بڑھا۔ ہم پہلے ہی سے بیزار بیٹھے تھے، ہم نے کہا معاف کرو بھائی ..."

اس نے ذرا زیادہ تمیز سے کہا "معاف کیجئے! آپ لوتھر صاحب ہیں؟"
ہم بوکھلا گئے۔ آج کل کے گداگر بھی کس اعتماد کے ساتھ بھیک مانگتے ہیں۔ ہم نے خفت سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس اثنا میں اس نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے آگے بڑھایا۔

"میں انٹرنیشنل لٹریچر اسوسی ایشن کا سکریٹری جنرل اور آج کے جلسہ کی استقبالیہ کمیٹی کا چیرمین ہوں۔ آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ چلئے آپ کو لے چلوں"
ہمارا دل بیٹھ گیا۔

یہ اگر سکریٹری جنرل ہے تو عام ممبر کیسا ہوگا۔ ہم مسکرا کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ تمام راستے منہ کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔

"میں آپ کی وقت کی پابندی کی داد دیتا ہوں۔ آپ کی مثال سے ہم نوجوانوں میں جوش پیدا ہوگا۔"

یہ ایک چوٹ پڑی ہم پر۔ اگر پچاس سال کا شخص اپنے آپ کو نوجوان کہے تو پھر ہم تو کسی صورت میں دودھ پیتے بچے سے بڑے نہیں تھے۔ ظاہر ہے جلسہ بچوں کا ہی ہوگا۔ ہم نے سوچا۔

ایک گلی کے پاس گاڑی روک دی گئی۔ وہیں انتظار کرنے کا مشورہ دے کر وہ شخص اندھیرے میں گم ہوگیا۔ چند منٹوں کے بعد ایک اور شخص ایک ٹارچ لے کر آیا۔ اس کی روشنی اتنی مدھم تھی کہ اس کو دیکھنے کے لئے ہم کو بار بار اپنا لائٹر جلانا پڑا۔ ٹھوکریں کھاتے۔ گرتے پڑتے ہم ایک بوسیدہ گھر کے اندر پہنچے۔ وہاں ایک لکڑی کی کرسی پر ایک سفید پوش صاحب بیٹھے تھے اور صحن میں تین لڑکے ایک گیس کی لیمپ کو جلانے یا بجھانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

وہ سفید پوش صاحب اُٹھے اور ہم سے مصافحہ کر کے بولے "خوش آمدید میں آج کا مہمان خصوصی ہوں۔ آپ کا بڑی دیر سے انتظار ہو رہا ہے۔"

ہم نے پوچھا "باقی لوگ کہاں ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "منتظمین کا انتظار ہو رہا ہے۔ اس لیے میں سوچ رہا تھا کہ آپ آجائیں تو دونوں مل کر انتظار کریں گے یہ پہاڑ سی گھڑیاں کٹتے نہیں کٹتیں۔"

استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین نے مہمان خصوصی کو اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا جیسے کوئی راز کی بات کہنا چاہتے ہوں۔ مہمان خصوصی کرسی سے اُٹھ کر اُن کی طرف بڑھے تو میزبان نے ہمیں اشارہ کیا کہ جلدی سے کرسی پر تشریف رکھیں کرسی ایک ہی تھی۔ ہم موقع کی نزاکت کو تاڑ گئے۔ فوراً اس پر براجمان ہو گئے۔

آدھے گھنٹے کے بعد ہم نے پوچھنے کی جسارت کی کہ آیا جلسہ آج شروع ہوگا کہ کل۔ ہمارے میزبان نے جواب دیا واہ صاحب یہ بھی کیا بات کہی آپ نے جلسہ ہوگا اور آج ہی ہوگا۔ صرف چند اور اصحاب کا انتظار ہے۔ اتنی دیر میں ایک شخص تین کرسیاں اٹھاتا ہوا آیا۔ ایک اور شخص پھولوں کے ہار لے آیا۔ ادھر گیس لیمپ بھی آخر جلنے کو رضامند ہو گئی تھی۔ اب حالت یہ تھی کہ صدر جلسہ اور مہمانِ خصوصی

کے علاوہ منتظمین میں سے تین اصحاب حاضر تھے۔ سامنے ایک کپڑے کا بڑا جھنڈا لگا ہوا تھا جس پہ جلی حروف میں آل انڈیا کنونشن لکھا ہوا تھا۔ ہم نے سوچا اگر ایسے کنونشن کے لیے بھی سارے ہندوستان سے صرف دس آدمی اکٹھے نہ ہو سکیں۔ تو پھر پولیس کمشنر کو پانچ سے زیادہ افراد کے اجتماع پہ پابندی کی کیا ضرورت تھی۔ یا ہو سکتا ہے کہ اسی امتناعی حکم کی وجہ سے یہاں پانچ سے زیادہ لوگ نہ آئے ہوں۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ ایک بوڑھا شخص اور آ گیا۔ ہمارے میزبان نے اس کو خوش آمدید کہا۔ اس نے قدرے غصّے سے پوچھا "ابھی تک جلسہ ختم نہیں ہوا؟ میں تو اپنا گیس لیمپ لینے واپس آیا تھا۔" ہمارے میزبان نے اُس سے ایک گھنٹہ کی اور مہلت مانگی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا رخصت ہوا۔

ہم نے گڑگڑا کر تجویز کی کہ جلسہ یا تو شروع ہونا چاہیئے یا برخواست۔ مہمانِ خصوصی نے ہماری تائید کی۔

میزبان نے اُٹھ کر چند رسمی جملے کہہ کر ہمیں کرسیٔ صدارت سنبھالنے کے لئے مدعو کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم لکڑی کی کرسی سے اُٹھ کر بید کی بنی ہوئی کرسی پہ آ بیٹھیں۔ اسی طرح مہمانِ خصوصی کو بھی زحمت دی گئی۔ پھر دونوں کی باری باری گلپوشی کی گئی۔ ہر بار چاروں طرف سے چار لوگوں نے تالیاں بجائیں۔

پھر استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین کی تقریر شروع ہوئی۔ انھوں نے جیب سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا۔ کچھ ہمارے متعلق اور کچھ مہمانِ خصوصی کے بارے میں تعارفی کلمات سے نوازا۔ ان کی تقریر سے ہمیں اپنے بارے میں بہت

مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ کاش کہ اس وقت بیگم بھی وہاں موجود ہوتیں تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ کیسے شخص کی وہ شریکِ حیات ہیں۔ ہم بیٹھے بیٹھے اُن کی قسمت پر رشک کرنے لگے اور رفتہ رفتہ ہمارے تمام احساسِ کمتری دور ہونے لگے۔ کتنا اچھا تھا وہ شخص جو ہمارے کانوں میں شہد گھول رہا تھا! جب ہماری سوانح حیات اور اس پر تبصرہ ختم ہوا تو ہم اونگھنے لگے۔ ان کی تقریر لوری کا کام کر رہی تھی۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ہم کب سو گئے۔ خواب میں ہم نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا جلسہ ہو رہا ہے۔ ہزاروں لوگ جمع ہیں اور ہم ایک دھواں دار تقریر کر رہے ہیں۔ لوگ تالیوں پر تالیاں بجا رہے ہیں۔ پھر یکایک ہمیں کسی نے جھنجھوڑا۔ ہم نے آنکھ کھولی تو معلوم ہوا کہ میزبان عمومی اور مہمانِ خصوصی کی تقریریں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ تھک کر بیٹھ چکے تھے۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو (۱۱) بجنے کو تھے۔ اب میزبان نے ہم سے گزارش کی کہ ہم دوسری جنگِ عظیم کی تاریخ پر اپنا ایڈریس پڑھیں۔ ہم اُٹھے۔ گیس لیمپ آخری دموں پر تھی۔ ہم نہیں سمجھتے تھے کہ وہ ہماری تقریر ختم ہونے تک جلنا گوارا کرے گی۔ ویسے بھی ہم سب کچھ بھول چکے تھے۔ جیب میں ہماری (۴۵) منٹ کی تقریر کی کاپی موجود تھی۔ لیکن دفعتاً ایک آئیڈیا ہمارے ذہن میں کلبلایا۔ ہم نے تقریر شروع کی ـــــ "صاحبان! بہت وقت ہو چکا ہے اور دو فاضل مقررین کی تقریروں کے بعد میرے لیے کچھ اور کہنے کی گنجائش نہیں۔ مجھے دو باتیں کہنے کے لیے کہا گیا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کی تاریخ اور اُس پر ہمارا ایڈریس۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز کی تاریخ تھی ۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء اور اُس وقت ہمارا ایڈریس تھا "پانچ کینٹ روڈ لاہور"۔ یہ کہہ کر ہم بیٹھ گئے۔

برآمدہ تالیوں سے گونج اٹھا۔ گیس لیمپ نے ایک بھبکا مارا اور بجھ گئی ـــــ اور ہم نے اندھیرے میں باہر جانے کا راستہ ٹٹولنا شروع کیا۔

■■

گمنامی کی برکتیں

دُنیا میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ وی۔ آئی۔ پی، آئی۔ پی۔ اور
پی یعنی بہت اہم شخص، اہم شخص اور صرف شخص۔ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ
وہ اہم اور بہت اہم شخص بنے ہر انسان شہرت کا متلاشی ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ
گھر گھر اس کے نام کا چرچا ہو۔ اُس کی تقریریں اس کے بیانات اُس کی تصویریں اخباروں
میں چھپیں۔ لوگ باگ اس کی نظر عنایت حاصل کرنے کے لئے اس کی چاپلوسی کریں۔
اُسے ہر جلسے میں مدعو کیا جائے اُس کا نام زبان زد عام و خاص ہو۔ شہرت کے
تعاقب میں انسان کیا کیا حیلے نہیں کرتا۔ سیاسی پارٹیوں میں شامل ہوتا ہے، مذہبی اداروں
کا ممبر بنتا ہے۔ قسم قسم کی مجلسیں اور انجمنیں بناتا ہے تاکہ ان کے صدر، نائب صدر،
معتمد، خازن، مجلس عاملہ کے رکن یا صرف عام ممبر کی حیثیت سے اِسے کچھ اہمیت
مل سکے۔ ہر موضوع پر موقع بے موقع، محل بے محل، وہ رائے زنی کرتا ہے۔ خود کو
الکشن کا ٹکٹ ملے یا نہ ملے وہ ہر لیڈر کی کامیابی پر، اس کی سالگرہ پر تہنیتی
اور اس کی ہار یا انتقال پر تعزیتی پیغام شایع کرتا ہے۔۔ ـــــــــــــ

عید اور دیوالی جیسے اہم تہواروں پر جنتا کے نام مبارک باد کا پیغام جاری کر کے
ان کو مذہبی اور انسانی اتحاد کی تلقین کرتا ہے۔ جشنِ جمہوریہ پر ہندوستانی جمہوریت
زندہ باد اور آزادی کی سالگرہ پر آزادی پائندہ باد کے نعرے لگاتا ہے۔ اگر
راشٹر پتی یا وزیر اعظم کے استقبال اور وداع کی تقریبوں کے لئے وہ دعوت نامہ
حاصل کرنے میں ناکام رہے تو اپنے گھر بیٹھے بیٹھے ہی وہ ان کے لئے خیر مقدمی
یا وداعی بیان اخباروں کو بغرض اشاعت بھیج دیتا ہے اور وہ بھی اپنی طرف
سے نہیں، عام شہریوں کی طرف سے۔ گویا کہ وہ ان کا چہیتا نمائندہ ہے۔ اگر وہ
اپنے گھر کے سامنے والی نالی کی مرمت کی درخواست لے کر بلدیہ پہنچے تو اخبار
میں یہ بیان دیتا ہے کہ اس نے بلدیہ کمشنر سے مل کر ان کی توجہ محلہ کی صفائی کی
ضرورت کی طرف مبذول کروائی اور کمشنر صاحب نے جلد ہی اس کارروائی کی یکسوی
کا انھیں تیقن دیا ہے۔ ایسے شخص کی گھر کی حالت بے شک دگرگوں ہو، اسے دن
میں دو وقت کا کھانا بھلے ہی نصیب نہ ہو، اس کے گھر میں چاہے پتلی سی دال
جوتیوں میں بٹتی ہو لیکن اسے شہرت کی دھن زندہ رکھے رہتی ہے۔ اس کا یہ
عقیدہ رہتا ہے کہ اور نہیں تو کم از کم اس کے دو بیانات ایک پیغام اور ایک
تصویر فی ہفتہ جنتا کو ضرور پہنچنی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو تو جنتا کا بُرا حال ہو جائے گا
شہرت میں کیا رکھا ہے اور اس کے موقع و محل کی کیا قیمت ہے، اس کا
شاید ایسے لوگوں کو اندازہ نہیں ہوتا وہ قعرِ گمنامی کی برکات پر غور نہیں کرتے۔
انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شہرت کے لئے انسان کو اپنا دل، دماغ، اپنا جسم، اپنا
وقت اپنی روح اور اپنا ضمیر دوسروں کو بیچنا پڑتا ہے۔ ویسے ضمیر کا بیچنا کوئی
آسان کام نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ اپنا ضمیر بیچنے جائیں تو خریدنے والے

صاحب کہتے ہیں، نہیں صاحب ہم تو خود اپنا ضمیر بیچنے کی فکر میں ہیں۔ آپ کا ضمیر لے کر کیا کریں گے، ہاں! اگر خود ہمارا ضمیر کہیں بک گیا تو پھر خرید لیں گے یا آپ کا ضمیر بھی بکوا دیں گے۔ اگر کوئی شخص ضمیر خریدنے کے موقف میں ہو بھی تو آپ کا ضمیر ٹٹول کر تول تال کر ایک لمبی سانس بھر کر کہتا ہے "معاف کیجئے آپ کا ضمیر تو کچھ بوجھل سا دکھائی پڑتا ہے، ہمیں تو کسی ہلکے پھلکے ضمیر کی تلاش ہے ضمیر کا بیوپاری بے چارہ اپنا سا مُنہ لے کر واپس ہوتا ہے اور کسی اور خریدار کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔

دماغ کے خریدار تو بہت ہیں لیکن یہ ایک ناپید شئے کے مترادف ہے جیسے بوجھل ضمیروں کی بہتات ہے ویسے ہی ہلکے دماغوں کی بھی بھرمار ہے لیکن ہلکے دماغوں کی مانگ نہیں، دل بیچنا تو غالب نے فیشن بنا دیا تھا بقول خود وہ اکثر بازار جاکر نئے دل اور جاں خرید لایا کرتے تھے۔ آج کل تو جان بہت سستی ہوگئی ہے۔ اور دل مفت ملتے ہیں۔ اس لئے دل اور جان کے بیچنے والوں کو بھی معقول فائدے کی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔

جسم کا بیوپار تو بہت پرانی بات ہے جسم بکتے بکتے بوڑھے ہو جاتے ہیں اور پھر جلایا یا دفنا دیئے جاتے ہیں۔ ہمیں جسم دل و دماغ، روح اور ضمیر بلکہ کپڑے لتے اور پرانے جوتے بیچنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اگر آج کے زمانے میں کسی شخص کو ان چیزوں کی قیمت مل سکتی ہے تو یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔ اگر یہ سب کچھ بیچ کر بھی شہرت نہ ملی تو کیا فائدہ ہوگا؟

کبھی آپ نے گمنامی کی برکتوں پر غور کیا ہے کبھی آپ نے یہ سوچا ہے کہ مشہور لوگوں کو اپنے وقت، اپنے دل و دماغ اپنی ذات اور اپنی زندگی پر کتنا کم اختیار ہوتا ہے؟ ادھر سورج طلوع ہوا۔ اُدھر ان کے گھر اہلِ غرض کا تانتا

بندھ گیا۔ ایک صاحب مُصر ہیں کہ آپ ان کے بیٹے کی نوکری کے لئے فلاں صاحب سے سفارش کریں۔ دوسرے صاحب کا تقاضا ہے کہ ان کے داماد کو کنٹریکٹ دلوانے کے لئے فوراً ان کے ساتھ فلاں عہدہ دار کے گھر چلیں۔ کوئی صاحب آپ سے فون پر فوری ہدایات جاری کروانا چاہتے ہیں۔ کسی سائل کو مالی امداد کی ضرورت ہے تو کوئی انصاف کے نام پر اپنا حق مانگتا ہے۔ آپ عذر کرتے ہیں کہ میرے پاس گاڑی نہیں تو وہ ٹیکسی فراہم کرتے ہیں۔ آپ نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا تو وہ آپ کو ایرانی ہوٹل میں ناشتہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ اگر ابھی تک نہائے نہیں تو وہ اپنے ہاتھوں سے آپ کو نہلانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ غرض کہ اہم شخص کا گمنام شخص کے سامنے کوئی عذر نہیں چل سکتا اور خصوصاً جبکہ اس نے آپ کو ووٹ دیا ہو۔

ہماری زندگی میں بے شمار باتیں یا حرکتیں ایسی ہیں جو کبھی نہ کبھی ہم سب کرنا چاہتے ہیں۔ اور جن سے ہماری آزادی کو معانی ملتے ہیں۔ مثلاً آپ ایرانی ہوٹل میں چائے پینا چاہتے ہیں، کسی تھرڈ کلاس تھیٹر میں فلم دیکھنا چاہتے ہیں۔ حیدرآباد کے جمعرات بازار سے چوری کا مال خریدنا چاہتے ہیں۔ دہلی کی جامع مسجد سے کباڑے کا مال لینا چاہتے ہیں۔ محبوب کی مہندی جاکر غزلیں اور قوالیاں سُننا چاہتے ہیں۔ چلتی ہوئی بس پر چھلانگ لگاکر چڑھنا چاہتے ہیں۔ گاڑی میں بغیر ٹکٹ سفر کرنا چاہتے ہیں دل میں آئے تو رکشا کی سواری کرنا چاہتے ہیں۔ برسات کے موسم میں کپڑے اُتار کر دل بھر کے بیٹھ میں نہانا چاہتے ہیں۔ راہ چلتی حسیناؤں پر آوازے کسنا چاہتے ہیں۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے بے سُرے بے تال فلمی گیت گانا چاہتے ہیں، گلتے گاتے گلا سوکھ جائے تو وہیں نل سے چلّو میں پانی پینا چاہتے ہیں، پانی پیتے پیتے دل

دکھی ہو جائے تو اسی چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہتے ہیں۔ خودکشی کا ارادہ ترک
کرتے ہی سامنے جو کتّا نظر آتا ہے اُسے ایک پتھر اٹھا کر مارنا چاہتے ہیں۔ پاس بیٹھی
گائے کی دُم مروڑ کر اُسے وہاں سے اُٹھانا چاہتے ہیں۔ نکّڑ والی پان کی دوکان پر
کھڑے ہو کر ساری دُنیا کی پالیٹکس پہ رائے زنی کرنا چاہتے ہیں۔ وہاں سے بور ہوئے
تو مداری کے مجمع میں شامل ہونا چاہتے ہیں، ایسی بیسیوں بلکہ سیکڑوں اور حرکتیں ہیں
جن کا ارتکاب ہم سب کبھی نہ کبھی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ گمنام شخص ہیں تو آپ
سب کچھ کر سکتے ہیں اور کوئی پرواہ نہیں کرے گا لیکن اگر آپ کا نام ہے، آپ
مشہور شخص ہیں، معزّز ہستی ہیں، لوگ آپ کو جانتے ہیں، آپ کی تصویروں
سے آپ کو پہچانتے ہیں تو آپ کے ارمان دل ہی دل میں رہ جائیں گے۔ آپ اپنی بیشمار
معصوم آرزوؤں میں سے کسی ایک کو بھی پورا نہیں کر پائیں گے۔ اور کر بھی کیسے پائیں؟
بس میں چڑھیں گے تو کنڈکٹر پوچھے گا کیوں صاحب آج آپ کی گاڑی خراب ہو گئی
کیا؟ جو یہ زحمت کی آپ نے؟ آپ اگر رکشا لیں گے تو رکشاراں پھولا نہیں
سمائے گا "واہ صاحب! اب تو ہم بھی کہہ سکیں گے کہ اس رکشا میں بڑے بڑے
لوگ بیٹھ چکے ہیں۔ محبوب کی مہندی کی طرف سے گزریں بھی تو آپ کی تصویر لے لی
جائے گی جس سے آپ کا بلیک میل ہو سکتا ہے۔ جمعرات بازار کا قصد بھی کیا تو اگلے دن اخبار
میں خبر چھپ جائے گی کہ اس شہر میں چوروں کا ایسے بڑے بڑے لوگوں کے
ساتھ گٹھ جوڑ ہے۔ نام آور شخص ایسی کوئی حرکت اپنے شہر میں نہیں کر سکتا
اس لئے حکومت ایسے لوگوں کے لئے گاہے بہ گاہے بیرونی ممالک کے دوروں کا انتظام
کرتی ہے تاکہ یہ بے چارے لوگ گھٹن سے نہ مر جائیں۔

نام آور شخص اطمینان سے اپنے بیوی بچوں سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے

برعکس گمنام آدمی نہ صرف اپنے بیوی بچوں بلکہ دوسروں کی بیویوں اور بچوں کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔ وہ کسی بھی جلسے جلوس میں شریک ہوکر کسی کے خلاف یا کسی کی حمایت میں پُر زور نعرے لگا سکتا ہے کیوں کہ اُس کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔ وہ تمام دن راشن کی دوکان کی کیوُ میں کھڑا رہ سکتا ہے اور کوئی اسے پہچانے گا نہیں۔ وہ اپنے بچوں کے لئے دودھ کی تلاش میں در بدر بھٹک سکتا ہے اور کوئی اُسے دودھ نہیں دے گا۔ وہ بسوں کے پیچھے دوڑ دوڑ کر اپنی صحت بنا سکتا ہے اور کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

اس سے یہ نتیجہ نہ اخذ کرنا چاہیئے کہ گمنام انسان کی اہمیت نہیں۔ ہر اسکیم، ہر پراجکٹ، ہر منصوبہ، اس کی ضروریات، اُس کے نظریئے، اس کی اُمیدوں اور اُمنگوں کا سامنے رکھ کر بنایا جاتا ہے۔ ہر الیکشن سے پہلے بڑے سے بڑا آدمی گمنام لوگوں کے پاس جاکر ان سے ووٹ کی بھیک مانگتا ہے۔ ہر تقریر میں، ہر مباحثے میں گمنام کا ذکر آتا ہے۔ دُنیا کے بڑے سے بڑے لوگ اُس کے سر کی قسم کھاتے ہیں۔ وہ "کامن مین" کے نام سے ساری دُنیا میں مشہور ہے۔ اسے اپنا ضمیر، اپنا دل، اپنا دماغ، اپنا جسم کچھ بھی نہیں بیچنا پڑتا۔ صرف کبھی کبھی گروی رکھنا پڑتا ہے ــ 'کامن مین' آزاد ہے۔ وہ سر اونچا کر کے کہیں بھی جاسکتا ہے۔ اُسے عوام کی قوم کی اور ملک کی کوئی فکر نہیں؛ اسے صرف اپنی ذات، واحد اور ـــــ اپنے کنبے کی خوشحالی کی فکر ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ گمنامی کی تمام برکتیں نظرانداز کرکے لوگ نہ جانے کیوں شہرت کے پیچھے بھاگتے ہیں؟

■■

سویرے کی سیر

کسی پارٹی میں ایک شخص نے ڈینگ ماری "میں نے آج سے سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے۔"

پاس ہی کھڑے ہوئے اُس کے ایک دوست نے للکارا۔ "واہ! اس میں کیا بڑی بات ہے؟ میں نے کئی بار سگریٹ پینا چھوڑا ہے۔"

ابھی تک ہماری سیر کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ ہم نے کئی بار سیر کرنا شروع کیا لیکن چندر روز کے بعد ہی وہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ گزشتہ بیس برسوں میں ہم نے کم ازکم چالیس بار یہ کوشش کی ہے لیکن ہر بار ناکامی ہوئی۔ گرمیوں میں سیر کرنا شروع کیا تو پسینہ چھوٹنے لگا۔ سردیوں میں کوشش کی تو ٹھٹھرنے لگے۔ خزاں میں یہ نیک ارادے زرد پتّوں کی طرح جھڑ گئے۔ موسم بہار میں تہیہ کیا تو اپنے موڈ اور چمن کے اطوار میں کوئی مطابقت نہ پائی۔

نتیجتاً ہم ابھی تک کبھی بھی دس پندرہ دن سے زیادہ لگاتار سیر نہیں کر پائے۔ لیکن انسان ہمّت نہ ہارے اور کوشش کرتا رہے تو کیا کچھ نہیں کر سکتا۔

اس سال ہمارا ریکارڈ پنتالیس دن تک پہنچ گیا ہے۔ اور ہمیں ایسا لگتا ہے کہ اب یہ عادت پکی ہوگئی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ میں سے کئی ہونہار لوگ اس شاندار مثال کی تقلید کرنا چاہیں گے اور ہونا بھی ایسے ہی چاہیئے۔ آخر اچھی عادتیں اور نیک چلن اسی طرح پھیلتے ہیں لیکن ہم یہ وارننگ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ یہ کام آسان نہیں۔ اس کے لیے بلند ارادے، ہمت اور بُرد باری کے علاوہ پلاننگ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

دو کام بیک وقت کرنا آسان نہیں۔ اس لیے ہم نے اس بار سیر کرنے کی مہم میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے دفتر سے دو ماہ کی چھٹی لے لی۔ اگر دفتر جانے کا ڈر لگا رہے تو انسان پوری لگن سے سیر کی طرف رجوع نہیں ہو سکتا۔

آج کل ہم تڑکے اٹھتے ہیں، سیر کرنے جاتے ہیں۔ سیر سے تھک کر واپس آتے ہیں اور پھر اطمینان سے سو جاتے ہیں۔ اس طرح اپنی کھوئی ہوئی نیند پوری کر لیتے ہیں۔ چونکہ ہمیں دونوں باتوں کا تجربہ ہے اس لیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ دفتر کے مقابلہ میں گھر میں سونا کہیں بہتر ہے۔ دفتر میں تو کوئی نہ کوئی آپ کو ڈسٹرب کر دیتا ہے۔ اگر آپ کسی کو اپنے کمرے کے اندر نہ بھی آنے دیں تو بھی لنچ ٹائم ہو جاتا ہے یا پھر جب آپ خراٹے لے رہے ہوں تو دفتر میں چھٹی ہو جاتی ہے لیکن گھر میں تو آپ آرام سے سو سکتے ہیں اور کم از کم دن کے وقت تو آپ کو کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا!

خیر، سیر شروع تو کر دی، لیکن اس کی باقاعدہ عادت کیسے پڑی؟ ہمیں باقاعدگی کی ترغیب اُن نظاروں سے ملی جو اِس بار ہمیں سیر کرتے وقت دیکھنے کو ملے آج تک ہم سڑکوں پر سیر کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس بار ہمیں سیر کے لیے ایک پارک مِل گیا۔ دِلّی میں ایسے کئی پارک سرکار نے بنائے ہیں جہاں سیر بڑی اچھی

طرح کی جا سکتی ہے۔ ایک ایسے ہی پارک کے پاس ہمیں گھر مل گیا۔ پس ثابت ہوا کہ باقاعدہ سیر کے لیے ایک پارک کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ ایک عدد پارک خرید ہی لیں۔ اگر آپ کے پاس اتنا پیسہ نہ ہو تو پارک کے نزدیک ایک عدد گھر خرید لیں۔ اگر اس میں بھی کچھ دقّت ہو تو ایک مکان کرایہ پر ہی لے لیں۔ اگر اتنا بھی نہ کر سکیں تو کسی طریقہ سے پارک تک پہنچنے کا انتظام کر لیں۔ کار پر، سکوٹر پر، سائیکل پر، اگر آپ اپنی ٹانگوں پر ہی وہاں پہنچیں گے تو وہاں تک پہنچتے پہنچتے ہی آپ کی سیر ختم ہو جائے گی۔

صبح کے وقت صرف امیر یا متوسط طبقے کے لوگ سیر کرتے ہیں۔ غریب لوگ اس وقت کام پر جاتے ہیں۔ اس لیے انہیں سیر کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ اگر آپ امیر بننا چاہتے ہیں تو سویرے کی سیر شروع کر دیجئے۔

سُنا ہے کہ سیر سے صحت اچھی رہتی ہے لیکن ہم نے سیر کرنے والوں کی خراب صحت بھی دیکھی ہے اور سیر نہ کرنے والے صحت مند لوگ بھی دیکھے ہیں اس لیے اس دعوے کا کوئی ثبوت نہیں لیکن سائنسدان کہتے ہیں کہ ان کے پاس ثبوت ہے انھوں نے چند خرگوشوں کو کچھ عرصہ کے لیے روزانہ سویرے سیر کروائی جس سے اُن کی صحت بہتر ہو گئی پھر اُن کی سیر بند کر دی۔ اس سے ان کی صحت گر گئی۔ ہمیں خرگوش بڑے اچھے لگتے ہیں۔ کتنے بھولے، پیارے اور ڈرپوک ہوتے ہیں جو بات خرگوشوں کو راس آتی ہے وہ ہمارے لیے بھی ٹھیک ہوتی ہے اس لیے ہم نے اس ثبوت کو تسلیم کر لیا۔

سیر اکیلے کی جا سکتی ہے یا دوستوں اور ہمسایوں کے ساتھ، یا بیوی کے ساتھ یا پھر۔ کُتّے کے ساتھ!

جو لوگ دوستوں کے ساتھ سیر کرتے ہیں، وہ سیر کم اور خوش گپیاں زیادہ کرتے ہیں۔ ایسی سیر کے دوران تازہ ترین خبریں، حالات حاضرہ پر تبصرہ اور سیاسی اور نجی پیشین گوئیاں بڑی اونچی آواز میں کی جاتی ہیں اور بڑی دُور دُور تک سُنی جا سکتی ہیں۔

اگر خاوند اور بیوی اکٹھے سیر کو جائیں تو جہاں خاوند کے صرف پاؤں چلتے ہیں، وہاں بیوی کے پاؤں کم اور زبان زیادہ چلتی ہے۔ قدرتی بات ہے۔ بے چاری کو تمام رات خاموش سونا پڑتا ہے۔ صبح اُٹھنے پر مرد سب سے پہلے آنکھ کھولتا ہے، اور عورت زبان۔ سیر میں خاوند کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اگر وہ بیوی کی باتیں نہ بھی سُنے تو بھی بیوی درختوں اور جھاڑیوں سے مخاطب ہو سکتی ہے اور اُسے یہ بھرم رہتا ہے کہ اُس کی باتیں سُنی جا رہی ہیں۔ اس لیے بیوی کی خوشی کے لئے سَیر ایک مفید چیز ہے۔ ہم نے بیگم کو اس شرط پر اپنے ساتھ سیر پہ لے جانا شروع کیا ہے کہ وہ سَیر کے دوران خاموش رہیں گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ ہی میں انھوں نے سیر کرنا چھوڑ دیا۔ کہنے لگیں کہ آپ تو ہوا خوری کرتے ہیں اور میں گھُٹن سے مرتی ہوں۔

کتّوں کے ساتھ سیر کرنے والوں کو دیکھ کر یہ پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ مالک کون ہے اور کِس کو سیر کروا رہا ہے، کتّا مالک کو جگہ جگہ روکتا ہے تیز تیز آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے یا سُست رفتاری سے پیچھے رہ جاتا ہے کبھی وہ یکدم رُک جاتا ہے۔ گھاس کے پتّے کو یا پتھر یا کسی کھمبے کو سونگھنا شروع کر دیتا ہے۔ کسی ایک جگہ کا انتخاب کر کے اُس کے گرد گھومنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر وہ ایسے اطمینان سے وہاں رُک جاتا ہے گویا منزلِ مقصود مل گئی۔ اس وقت کتّے کا مالک اپنی خِفّت چھپا کر ایسی بے نیازی سے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیتا ہے کہ اس بدتمیز جانور سے ہمارا کوئی

تعلق ہی نہیں ۔ ہم نے کئی بار ایسے اٹکے ہوئے صاحبوں کو اوورٹیک کیا ہے۔
لیکن سیر پہ کتّے کو ساتھ رکھنے میں ایک خاص شان ہوتی ہے۔ اس سے صاحبی کی توثیق ہوتی ہے۔

ایک شخص جو روز اچھا بھلا اکیلا سیر کو آتا تھا، دیکھا دیکھی ایکدن ایک کتّے کو ساتھ گھسیٹ لایا۔ اُس کے ایک دوست نے بڑی معصوم حیرانی کے ساتھ پوچھا "گدھے کو سیر کرانے لائے ہو؟"

اس شخص نے بڑے فخر سے کتّے کی طرف دیکھا اور پھر جواب دیا:
"یہ گدھا نہیں، کتّا ہے کتّا"

دوست نے اُسے اِگنور کرتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے نہیں، اس کُتّے سے پوچھ رہا ہوں۔"

کچھ لوگ تیز تیز سیر کرتے ہیں۔ کچھ لوگ چہل قدمی کرتے ہیں، کچھ بڑی مشکل سے چل پاتے ہیں۔ سیر کی اقسام کی طرح، سیر کرنے والوں کی پوشاکیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ ایک صاحب گویا ومبلڈن سے بورگ کے ساتھ میچ کھیل کر آرہے ہیں۔ دوسرے پٹوڈی کے ڈبل لگتے ہیں۔ تیسرے صاحب اتنے گرم کپڑے پہنے ہوئے ہیں گویا سائبیریا جارہے ہیں اور ان کے ساتھ ہی چند نوجوان صرف نیکر اور بنیان میں ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ اتنے انفارمل کہ نائٹ سوٹ میں سلیپر گھسیٹتے گھسیٹتے چلے آتے ہیں۔ ایک زمرہ ایسے لوگوں کا ہے جو دھوتی اور کُرتے میں ہی نکلتے ہیں۔ ملک کی آزادی کے بعد یہ پوشاک ہر جگہ ہر موقع پر بلا جھجک پہنی جا سکتی ہے۔

عورتیں تو خوب سج دھج کر سیر کو نکلتی ہیں۔ ہمارے ایک دوست کی

بیوی صرف اس لیے سیر کرنے نہیں آتیں کہ اُن کا خاوند اُن کے لیے سیر والی پوشاکیں لاکر نہیں دیتا۔ بھلا ایک ہی ڈریس میں وہ روز روز کیسے سیر کرسکتی ہیں؟ مسز ہمسایہ کیا کہیں گی؟

چند خوش مذاق خواتین اچھی پوشاک کے علاوہ عطر اور سینٹ وغیرہ لگا کر سیر کرتی ہیں۔ یہ جو کہتے ہیں کہ پھولوں میں خوشبو ہوتی ہے تو یہ انہیں کے دم بہ دم سے ہے۔ جدھر سے گزرتی ہیں بھینی بھینی مہک چھوڑتی جاتی ہیں ورنہ آج کل کے پھولوں میں وہ مہک کہاں جس کا ہمارے غزل گو شاعر ابھی تک چرچا کئے جاتے ہیں اُن میں کبھی کوئی سویرے سیر کرنے گیا ہے؟

پارک میں صبح کے وقت ایک فیشن پریڈ ہوتی ہے جو شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں ہونے والی پریڈوں سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔

اکثر لوگ پارک میں سیر کرنے کی بجائے قسم قسم کی ورزشیں کرتے ہیں۔ اکھاڑے والی ورزشیں، یوگا، جوگنگ کئی قسم کی کسرتیں وہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ادھیڑ عمر کی آٹھ دس عورتوں اور مردوں کا ایک کو ایجوکیشنل گروپ ہے۔ وہ پہلے تو اُچھلتے کودتے ہیں اور پھر مل کر زوردار قہقہے لگاتے ہیں۔ اُنہیں بے ڈھنگے پن سے کودتے دیکھا تو ہم نے سمجھا کہ شاید پاگل خانے سے کچھ پاگل لوگوں کو چہل قدمی کے لایا گیا ہے پھر اُن کے قہقہے سُننے تو لگا کہ ہمارا مذاق اُڑا رہے ہیں حالانکہ ہم بالکل صحیح طریقے سے سیر کر رہے تھے اور ہمارا ڈریس بھی مناسب تھا۔ ایک سینئر سیر کرنے والے نے ہمیں بتایا کہ یہ نارمل لوگ ہیں اور کود کود کر جسم کی اور قہقہے لگا کر پھیپھڑوں کی ورزش کرتے ہیں۔ یہ ورزش اُن لوگوں کے لیے مفید ہے جن کی زندگی میں ہنسی کی کمی ہو اور جو قہقہے لگانا بھول گئے ہوں۔ ایک

دن ان سے کچھ فاصلہ پر کھڑے ہو کر ہم نے بھی ایک قہقہہ لگایا۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرانی اور خوشی ہوئی کہ ہم بھی ابھی تک قہقہہ لگا سکتے ہیں!

ان "خالص" سیر کرنے والوں کے علاوہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سیر کے بہانے کچھ ضروری کام بھی کر لیتے ہیں۔ کئی ڈبّو قسم کے خاوند۔ بیویوں کے پہلو سے اُٹھ کر اپنی ماؤں کی یاد میں "مدر ڈیری" کے بُوتھ پر کھڑے پائے جاتے ہیں۔ چند لوگوں کو آلو اور پیاز کے ڈھیروں کو اُلٹ پلٹ کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بے چارے چاہے کتنی ہی کوشش کریں، گھر پہنچنے پر ضرور ان کی مرمّت ہوگی کہ اتنی خراب اور مہنگی سبزی کیوں لائے ہو۔

ایک صاحب ہیں جو چیونٹیوں کو ڈھونڈتے رہتے ہیں جہاں بھی انہیں چیونٹیوں کا کارواں ملتا ہے، وہ اپنے تھیلے میں سے آٹا نکال کر اُن پر پھینکتے جاتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ اس طرح شاید وہ ثواب کمانا چاہتے ہیں لیکن پتہ چلا کہ وہ راشن کے آٹے سے چیونٹیوں کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک دوسرے صاحب پارک کی دیوار کے ساتھ بڑی دیر تک لگے سسکیاں لیتے رہتے ہیں۔ ہم نے انہیں یہودی سمجھا لیکن غور سے دیکھا تو سردار صاحب نکلے۔ غالباً اپنے ناکردہ گناہوں کے پچھتاوے کے طور پر یہ حرکت ان سے سرزد ہوتی ہے۔

ان لوگوں کے علاوہ ایک طبقہ "قدرت پرستوں" کا ہے۔ یہ لوگ پَو پھٹنے سے پہلے ہی اپنی 'سیر' ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر اندھیرے میں غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عموماً ان لوگوں کے ہاتھوں میں ایک پرانا ٹوٹا ہوا ڈبّہ یا برتن ہوتا ہے۔ موقع ملتے ہی یہ لوگ درختوں کے پیچھے یا جھاڑیوں

کی اوٹ میں غائب ہو جاتے ہیں، پھر نمودار ہوتے ہیں تو مُنہ میں لکڑی کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جسے چبانے کی وہ ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اِن کا یقین ہے کہ لکڑی کو چبانے کی کوشش میں جو دانت بچ جائیں وہ نہایت مضبوط ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ باقی کے سیر کرنے والوں سے بازی لے جاتے ہیں۔ واپس گھر پہنچنے تک یہ لوگ دو بٹا تین تیار ہوتے ہیں۔ کیا کیا جائے۔ کچھ لوگ زندگی کی ہر تفریح سے کچھ نہ کچھ مفید، ناجائز اور کار آمد پہلو نکال لیتے ہیں۔

ہمیں اب لگاتار سیر کرتے ہوئے پنیتالیس روز ہو گئے۔ اب ایسا لگتا ہے کہ ہمیں سیر کی عادت پڑ گئی ہے۔ اب جوں ہی مرغ بانگ دیتا ہے۔ بستر میں ہمارے پاؤں ہلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ آج کون سے نظارے کس قسم کے لوگ دیکھنے کو ملیں گے۔ سیر سے اگر صحت بہتر نہ بھی ہو تو یہ جو مفت کا تماشہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ کچھ کم بات نہیں۔ غالب بھی صرف "تماشائے اہلِ کرم" دیکھنے کے لئے صبح سیر کو جاتے تھے۔ اب ہمارے اشتیاق کا یہ حال ہے کہ اکثر ساری ساری رات نیند نہیں آتی اور بارہا ہم فیض کی طرح پوچھتے رہتے ہیں کہ "اے دِل کب رات بسر ہو گی"!

■■

میاں بیوی

میاں بیوی کا رشتہ مذکر اور مؤنّث کا، مرد اور عورت کا رشتہ ہوتا ہے۔ اُس میں ایک میاں اور ایک بیوی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ رشتہ اُلٹا بھی ہوتا ہے یعنی ایک بیوی اور ایک میاں، عموماً سارے مہذب سماجوں میں یہ رشتہ اُلٹا ہی ہوتا ہے۔ غیر مہذب سماجوں کے بارے میں بحث کرنا فضول ہے کیونکہ ہمیں اور خاص کر مجھے کبھی کسی ایسے سماج میں رہنے کا موقع نہیں مِلا۔ ویسے بھی ایسی بحث سے بین الاقوامی تعلقات پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ بحیثیت مجموعی وہ تعلقات پہلے ہی سے اتنے کشیدہ ہیں کہ انھیں بد سے بدتر بنانے میں ہماری اعانت کی قطعی ضرورت نہیں کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات بھی ازدواجی رشتہ کی طرح ہیں۔ مثلاً امریکہ اور روس اور روس اور چین کے باہمی تعلقات دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ملک نہیں میاں بیوی ہیں —

میاں بیوی کے تعلق کا نام شادی ہے۔ ہندوؤں میں لڑکے اور لڑکی کو آگ میں دھکیلنے کی دھمکی دے کر شادی انجام دی جاتی ہے۔ لڑکے اور

لڑکی کو چار گرہ کپڑے سے باندھ کر آگ کے گرد چکر لگوائے جاتے ہیں تاوقتیکہ وہ شادی کے لئے رضامند نہ ہو جائیں۔ عموماً پانچ پھیروں کے اندر اندر دونوں چکرا کر بے حال ہو جاتے ہیں اُسی عالم بے حواسی میں اُن کی شادی کر دی جاتی ہے۔ شادی کی قسمیں اور وعدے سنسکرت ایسی زبان میں دلائے جاتے ہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی بعد میں اگر فریقین میں سے کوئی اعتراض بھی کرے تو اُسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے کہ قانون سے لاعلمی کوئی واجب عذر نہیں۔

مُسلمانوں میں شادی کے وقت لڑکے اور لڑکی کو ایک دوسرے سے دُور رکھا جاتا ہے تاکہ کہیں وہ وقت سے پہلے ہی تکرار کرنا شروع نہ کر دیں۔ اُدھر لڑکے کے بھائی بند اُسے تھامے رہتے ہیں۔ اِدھر لڑکی کی سہیلیاں اُسے قابو میں رکھتی ہیں۔ عیسائیوں میں پادری فریقین پر واضح کر دیتا ہے کہ اس رشتے سے بجز مرگ چھٹکارا نہیں۔ پھر بھی دیکھا گیا ہے کہ کئی بہادر جوڑے قبل از مرگ ایک بار نہیں بار بار اِس پھندے سے بچ نکلتے ہیں، لیکن مہذب سماج کا نظام ایسا ہے کہ وہ ایک شکنجے سے نکل کر دوسرے میں پھنس جاتے ہیں۔ بہت کم بالغ لوگ اس رشتے سے بچ رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے بچ کر رہنا چاہیئے!

شادی، تضاد کا رشتہ ہے۔ سب سے پہلے جنسی تضاد، یعنی ایک نَر اور دوسرا مادہ، پھر فطرت کا تضاد —— ایک باہر کی طرف مائل تو دوسرا اندر کی طرف راغب۔ ایک آزادی پسند اور دوسرا غلامی پسند — پھر طبیعت کا تضاد ایک کو گرمی لگتی ہے تو دوسرے کو سردی۔ ایک سونا چاہتا ہے تو دوسرا جاگنا۔ ایک خاموشی چاہتا ہے تو دوسرا گفتگو، ایک خلوت پر مرتا ہے تو دوسرا جلوت کا شیدائی، ایک تنہائی کا دلدادہ ہے تو دوسرا انجمن کا شیدا۔ ایک اخبار پڑھنا

چاہتا ہے تو دوسرا اسکینڈل سنانا۔ ایک دوستوں کو مدعو کرنا چاہے تو دوسرا خود دعوت پر جانا پسند کرتا ہے۔ ایک صلح اور آشتی چاہتا ہے تو دوسرا بجنگ آمد۔ ایک بجنگ آمد تو دوسرا صلح اور آشتی کا متلاشی۔ اس لیے دونوں بجنگ آمد۔

دن کے وقت تو ایک گھر کے باہر اور دوسرا اندر رہتا ہے اس لیے تصادم سے بچاؤ رہتا ہے۔ کئی دور اندیش مرد نہ صرف خود گھر سے باہر چلے جاتے ہیں بلکہ اپنی بیوی کو بھی نوکری پر بھیج دیتے ہیں۔ (خاکسار بھی ایسی دور اندیشی کا مرتکب ہے) سنا ہے اس انتظام سے حالات نسبتاً خوشگوار رہتے ہیں ــــ خدا خدا کرنے کے باوجود رات آتی ہے۔ دن بھر کا کام آج ختم ہوتا ہے۔ میاں سونا چاہتا ہے۔ بیوی کہتی ہے "یہ بھی کیا زندگی ہے کھایا پیا سو گئے ہم تو ابھی پڑھیں گے۔"

میاں کہتا ہے "تمہیں ابھی تعلیم کی ضرورت ہے، تم پڑھو، ہم تو سوئیں گے، سونے سے پہلے ذرا پنکھا بند کر دینا، سردی لگ رہی ہے۔"

"ارے واہ، اسے آپ سردی کہہ رہے ہیں، میں تو پنکھا تیز کرنے والی تھی۔"

میاں لڑنے کے موڈ میں نہیں "اچھا تو یہ کھڑکی بند کر دینا۔"

"ارے یہ خوب ہے، اگر کھڑکی بند کر دی تو پنکھا چلانے کا کیا فائدہ ہوا، وہی باسی ہوا کھاتے رہیں گے۔"

"اچھا بھئی تم کھڑکی بھی کھول لو، ہمیں پھر ایک کمبل دے دو۔"

"اوئی ماں! اس موسم میں کمبل! کیا دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے جو کمبل کی ضرورت پڑی؟"

"اچھا بھئی کمبل بھی نہ لاؤ، پنکھا بھی چلا دو اور کھڑکی بھی کھول دو، میرے اوپر تھوڑا سا ٹھنڈا پانی بھی گرا دو اور بستر کی نچلی چادر بھی نکال دو تاکہ آدھی رات کے وقت کہیں اسے اوڑھ نہ لوں، لیکن خدا کے لیے لڑنا نہ۔"

"اچھا تو میں خراٹے مارتی ہوں تو آپ ....."

مَیں جب ایسی باتیں لکھتا ہوں تو میری بیوی اکثر مجھ سے پوچھتی ہے آپ کو دوسروں کی ازدواجی زندگی کے بارے میں اتنا کیسے معلوم ہے؟ اور اگر ہے بھی تو مناسب ہے کہ آپ دوسروں کے بارے میں ایسی باتیں پبلک میں نہ کہیں۔ لوگ سمجھیں گے کہ شاید ہمارے تعلقات بھی ایسے ہی ہیں۔ اس سے خواہ مخواہ ہماری بدنامی کا خطرہ ہے۔ میرا جواب یہ رہتا ہے کہ ایک سیدھا سادہ فارمولا ہے جن لوگوں کے ازدواجی تعلقات ٹھیک نہیں ہوتے وہ کبھی ایسا نہیں لکھتے کیونکہ ادب برائے ادب ہوتا ہے کبھی کبھی ادب برائے زندگی بھی ملتا ہے لیکن ادب برائے صداقت نہیں ہوتا۔ اس روایت کی آڑ میں اکثر سچ بات بھی لکھتا ہوں تو لوگ سمجھتے ہیں، مذاق کر رہا ہے۔ اور یہی مزاح کی خوبی ہے۔ صرف مزاح کی صنف میں ہی چلتے چلتے۔ ضمناً گمراہ کن طریقے سے سچی بات کہی جاسکتی ہے اِسی لیے کرشن چندر مرحوم کے آخری الفاظ تھے "ادب برائے بطخ" اُنھوں نے اس کی تشریح کی نہیں۔ یہ کام وہ میرے لیے چھوڑ گئے۔ آپ نے بطخ دیکھی ہوگی۔ شاید اُسے سُنا بھی ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ نے اُسے سمجھا نہیں ہوگا۔ وہ ہمیشہ "قیں قیں" کرتی رہتی ہے اور ساتھ ہی بہت بے رُخی سے اپنی منزل کی طرف گامزن رہتی ہے۔ اُسے اپنی منزل کا اتنا خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارادے کے انہماک میں اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتی۔ میں سمجھتا ہوں یہی حال مزاح اور طنز نگار کا ہوتا ہے۔ بظاہر وہ "قیں قیں" کرتا ہے لیکن اصل میں وہ صداقت کا متلاشی رہتا ہے اور اس طرح ہنسی مذاق میں لوگوں کے کردار سدھارتا جاتا ہے جیسے کوئی نیند میں کسی کی حجامت بنا جائے، اور اُس شخص کو جاگنے پر معلوم ہو کہ میری تو حجامت بن گئی۔

لیکن میاں بیوی کے رشتے کا اس تھیوری سے کیا تعلق؟ بس یونہی سمجھ لیجئے کہ یہی اس رشتہ کا حاصل ہے کہ غیر دانستہ طور پر بغیر کوشش کے اس رشتہ کی چوکھٹ میں انسان پر خدائی کے، قدرت کے، کائنات کے ... ایسی ہی حقیقتیں

آشکار ہو جاتی ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ دنیا کی ساری حکمت اور دانشمندی اسی رشتہ کی بدولت رونما ہوئی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جس شخص نے یہ رشتہ نہ کیا وہ مکمل نہیں ہے۔ ویسے یہ ضروری نہیں کہ مرد اور عورت کے باہمی رشتہ کے لئے شادی ضرور کی جائے۔ کئی لوگ شادی کے بجائے محبت کر لیتے ہیں۔ محبت شادی سے پہلے یا شادی کے بعد کی صورتِ حالات کا نام ہے۔ کئی لوگ شادی کے چوکھٹے میں محبّت ڈھونڈتے ہیں انھیں ڈھونڈتے رہنے دیجئے۔ میں نے بھی کئی لوگوں کو اس کام پر لگایا ہے۔ اس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ پھر واپس نہیں آتے۔ کتنے لوگ ڈھونڈتے ڈھونڈتے پاگل ہو جاتے ہیں۔ عرفِ عام میں اُن کی ازدواجی زندگی بڑی خوش سمجھی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو مزاحیہ مضامین لکھ کر دُنیا کو سمجھانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ کئی لوگ جو خوش نہیں ہوتے وہ مزاحیہ مضامین لکھ کر۔۔۔۔ میری بیوی مجھے پھر ٹوک رہی ہے۔ خواہ مخواہ پول کھل جائے گا۔ پکڑے جاؤ گے۔ بدنام ہو جاؤ گے۔۔ ۔۔۔ تم کب سمجھو گے؟

دیکھا آپ نے میاں بیوی کا رشتہ، تضاد کا رشتہ؟ ایک کچھ کہنا چاہتا ہے دوسرا اُسے ٹوکتا ہے۔ ایک سچ بولنا چاہتا ہے دوسرا اُسے روکتا ہے۔ ایک میاں ہے دوسرا بیوی۔ ایک بیوی ہے دوسری میاں۔ رشتہ سیدھا بھی ہے، اُلٹا بھی ——— !

■■

بڑا آدمی

ایک جرنلسٹ کسی گاؤں پر مضمون لکھ رہا تھا۔ اُس نے وہاں کے ایک بزرگ سے پوچھا "کیوں میاں! اِس گاؤں میں کبھی کوئی بڑا آدمی بھی پیدا ہوا ہے؟" اُس نے جواب دیا "جی نہیں اِس گاؤں میں ہمیشہ بچے ہی پیدا ہوتے آئے ہیں۔"

..یہی ہماری زندگی کا المیہ ہے، پیدا تو بچے ہی ہوتے ہیں پھر بھی کئی بچے بڑے لوگ بن جاتے ہیں۔ ایسی حرکتوں کو روکا نہیں جا سکتا!

سماج کو بڑے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ عام آدمی ان سے اپنا موازنہ کر کے اپنے اندر احساسِ کمتری پیدا کر سکے۔ اگر بڑے آدمی نہ ہوتے تو ایسا احساس پیدا نہ ہوتا اس سے ان گنت ماہروں کو روزی نہ ملتی۔ پس ثابت ہوا کہ ان ماہرین کی روٹی روزگار کے لیے بڑے آدمیوں کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

بڑا آدمی زندگی کے ہر شعبہ میں پایا جاتا ہے، ہر کام میں، ہر پیشے میں، ہر گوشے میں بڑا آدمی مل جاتا ہے۔ بڑے آدمی کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے جس کا

استعمال وہ دوسروں کے لیے یا اُن کے خلاف کرسکتا ہے۔ بڑا آدمی انسانیت کو گروہوں میں بانٹتا ہے — اُس کے پیروکار اور اُس کے مخالف۔ اگر بڑے آدمی نہ ہوتے تو انسانیت کے ٹکڑے نہ ہوتے۔ ہر زمانے میں، ہر ملک میں، ہر شعبے میں جب بھی کوئی بڑا آدمی اُٹھتا ہے تو سماج، ملک، انسانی برادری اور قومیں بٹ جاتی ہیں۔ لڑائی جھگڑے پیدا ہوجاتے ہیں۔ اگر کوئی بڑا آدمی نہ ہوتا تو قومیں منتشر نہ ہوتیں، فرقے نہ ہوتے، گروہ نہ ہوتے۔ آپسی تنازعے نہ ہوتے۔ ساری دُنیا ایک کُنبہ ہوتی۔

جب تک بڑے آدمی پیدا ہوتے رہیں گے۔ توڑ پھوڑ کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ کچھ بڑے آدمیوں نے دھرتی کو مختلف دیشوں میں بانٹا، کچھ نے بانٹے ہوئے ملکوں کو جوڑنے کی کوشش کی۔ یعنی بڑا آدمی دُنیا کو جیسا پاتا ہے ویسا نہیں رہنے دیتا۔ بڑے پن کی نشانی یہی ہے کہ کچھ نہ کچھ اُتھل پتھل ضرور کی جائے عام انسان سوئے ہوئے کتّوں کو سونے دیتا ہے بلکہ وہ خود بھی ان کے ساتھ سو جاتا ہے۔ اس کے برعکس بڑا آدمی نہ صرف سوتے ہوئے کتّوں کو جگاتا ہے بلکہ ان کی بیداری کے بعد اُنہیں بھونکنے پر اُکساتا بھی ہے۔ یہ کسی گم نام بڑے آدمی کی برکت ہی ہے کہ ہم لوگ اکثر کتّوں کے بھونکنے کی وجہ سے رات بھر نہیں سو پاتے۔

بڑے لوگ بڑی عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔ لوگ بھی ان کے ساتھ عجیب و غریب سلوک کرتے ہیں۔ جب بھی بڑے لوگ کوئی نئی بات شروع کرتے ہیں، لوگ پہلے تو اُن پر نکتہ چینی کرتے ہیں، کبھی کبھی ان پر پتھراؤ بھی کرتے ہیں، ان کو طرح طرح کی اذیّت دیتے ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے اُن کی تائید کرنا شروع کردیتے ہیں۔ سچ ہے عوام کا

کوئی اعتبار نہیں۔

اکثر بڑے آدمی اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ لوگ اُن کو برداشت نہیں کر سکتے۔ سقراط، لنکن، گاندھی، کینیڈی وغیرہ ایسے کئی نام ہیں جن کا اپنے درمیان وجود عام لوگ برداشت نہ کر سکے۔ عام طور پر ایسے بڑے آدمیوں کو قتل کر دیا جاتا ہے جو آپسی بھائی چارے اور امن کا پرچار کرتے ہیں۔

اگر بڑا آدمی عام یا فطری موت بھی مرے تو لوگ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس کے بُت بناتے ہیں۔ بُت کی شکل میں بڑے آدمیوں کو دن رات، اندھیرے اُجالے دھوپ چھاؤں، گرمی اور جاڑے، بارش اور طوفان میں طرح طرح کے دُکھ جھیلتے ہوئے کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی خاص وجوہات کی بنا پر بڑے آدمی کو بڑی حد تک معاف کر کے اُس کے بُت کو بجائے کھڑا رہنے کے بیٹھنے کی اجازت دے دی جاتی ہے مثلاً چونکہ ملکۂ وکٹوریہ بہت موٹی تھی، اتنی کہ اُس کے لئے کھڑا ہونا بھی مشکل تھا اس لیے اُس کے بُت کو "صحت مندی" کی بنیاد پر بیٹھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اب تو ہندوستان میں اُسے بالکل معاف کر دیا گیا ہے اور اُسے یہاں سے چلے جانے کی اجازت بھی دے دی گئی ہے لیکن عموماً بڑے آدمیوں کے بتوں کو کھڑا ہی رہنا پڑتا ہے۔ اسکول کے بچوں کی طرح۔ کون کہتا ہے کہ موت کے بعد دُکھوں سے چھٹکارا مِل جاتا ہے؟

بڑا آدمی ہونے کے کئی فائدے ہوتے ہیں، ان کے نام پہ اسکول، کالج، ہسپتال، یتیم خانے، پارک وغیرہ قائم کئے جاتے ہیں۔ اگر کسی شہر یا ملک میں ایسے ادارے اتنی تعداد میں نہ ہوں تو سمجھ لیجئے کہ اُس میں بڑے آدمی کم تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔ عوام

کو اُن کی ذات سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جس دن اُن کی موت ہوتی ہے اُس دن چھٹی ہو جاتی ہے۔ کئی بڑے آدمی جن کو عوام کی بھلائی کا خیال نہیں ہوتا، اتوار یا کسی چھٹی کے دن انتقال کر جاتے ہیں اس طرح اُن کے ساتھ لوگوں کی چھٹی بھی مر جاتی ہے۔ جن بڑے لوگوں کو عوام کی فلاح وبہبود کا خیال ہوتا ہے وہ زیادہ تر شام کو دفتر اور اسکول بند ہونے کے بعد ہی اپنے جسم و جاں کا رشتہ ختم کرتے ہیں تاکہ نہ صرف چھٹی دی جا سکے بلکہ وقت پر مناسب طریقہ سے اس کا اعلان بھی کیا جا سکے۔ طالب علموں کو عمر رسیدہ بڑے لوگ زیادہ اچھے لگتے ہیں کیونکہ ان کی جلد موت کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

کہتے ہیں بڑے لوگ تب اُبھرتے ہیں جب سماج گراوٹ کی طرف جا رہا ہو۔ پس اگر ہمارا سماج خود ہی سدھرا رہے تو کسی بڑے آدمی کی ضرورت نہیں پڑے گی اس لیے اگر ہم بڑے آدمیوں سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں خود ہی اپنی حالت سنوار لینی چاہیئے اور وہ بھی جلد از جلد۔ ورنہ نہ جانے کب، کہاں اور کس بہانے سے کسی خاتون کو حمل ٹھہر جائے اور ہمارے امن میں خلل پیدا ہو جائے۔ ہم سے بار بار پوچھا گیا "بڑے آدمی بننا چاہتے ہو؟" ہم نے پوچھا "اس کے لیے کیا کرنا ہوگا؟"

"لوگوں سے بھلا بُرا سننا پڑے گا اور اس کی پرواہ کیے بغیر تمہیں اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہنا ہوگا۔ لوگ تمہیں گالیاں دیں گے، تم پر پتھراؤ کریں گے، تمھیں قتل کرنے کی بھی کوشش کریں گے۔ اگر قتل سے بچ گئے تو بڑے آدمی بن جاؤ گے۔"

"اور اگر نہ بچے تو؟"

"بعد از مرگ بڑے آدمی بن جاؤ گے۔"

"ہمیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"اگر زندگی میں ہی بڑے آدمی بن گئے تو چرچے کار ہوگی، زندگی کی تمام ضروریات پوری ہو جائیں گی تمھارے نام کی ہر جگہ چرچا ہوگی۔ بقیہ زندگی سُکھ چین سے گزرے گی۔"

"اور اگر مرنے کے بعد بڑا پن مِلا تو؟"

"تمھارے جنازے کے ساتھ ہزاروں لوگ ہوں گے۔ تمھاری بیوہ کی عزّت ہوگی۔ تمھاری اولاد اس کا فائدہ اٹھا سکے گی۔ تمھارے نام پر لوگ آپس میں جھگڑا کریں گے، مریں گے — اور کسی شاہراہ پر تمھارا بُت کھڑا کیا جائے گا۔"

یہ بُت والی بات سُن کر ہم چوکنّا ہو گئے۔

برسوں سے ہم ایک بڑے آدمی کے بُت کو دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ دن رات وہ بے چارا کھڑے کا کھڑا شہر کے ایک علاقہ میں پہرا دیئے جا رہا تھا۔ سارے پرندے اُس پر کھاد گراتے رہتے تھے، وہ بے چارا خاموش سب کچھ سہے جاتا تھا۔

ایک دن ہم نے دیکھا کہ وہ بُت توڑا جا رہا ہے۔ ہم نے وجہ پوچھی تو پتہ چلا کہ یہ فیصلہ ہوا ہے کہ وہ آدمی در اصل بڑا آدمی نہیں تھا اس لیے اب اس بُت کو توڑ کر اُس جگہ عوام کی سہولت کے لیے ایک بیت الخلا بنایا جائے گا۔

موت کے بعد یہ عزّت!

"نا بھئی" ہم نے جواب دیا۔ "ہمیں بڑا آدمی نہیں بننا، ہمیں عام آدمی ہی رہنے دو۔"

■■

پیشے

ہر انسان کو کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس سے بجز مرگ کوئی بچاؤ نہیں۔ پیشے بے شمار قسم کے ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ اپنے پیشوں سے مطمئن ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بزنس مین ہے تو ٹیچر بننا چاہتا ہے۔ اگر ٹیچر ہے تو کہتا ہے میں نے غلطی کی۔ ناکارہ قسم کے لوگ آئی۔ اے۔ ایس ہو گئے میں کیوں یہاں رہ گیا۔ آئی۔ اے ایس کا افسر سوچتا ہے میری آواز تو اچھی ہے میں بھی یونیورسٹی کا پروفیسر بن سکتا تھا۔ پولیس کا انسپکٹر ٹھیکیدار بننا چاہتا ہے ٹھیکیدار سیاستدان کی پشت پر رہ کر تنگ آجاتا ہے اور خود وزیر بننا چاہتا ہے۔ وزیر ایکٹر بننا چاہتا ہے اور ایکٹر جج بننے کے خواب دیکھتا ہے تاکہ اپنے کئے کی سزا نہ پا سکے۔

غرضیکہ ہر پیشہ ور انسان اپنے پیشے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنا چاہتا ہے لیکن بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو ابھی تک کسی پیشے نے نہ اپنایا ہو۔

یہ مضمون اُن معصوموں کے لیے لکھا گیا ہے جنھوں نے ابھی تک پیشہ نہیں کیا یا اُن کے لیے جو اپنا پیشہ بدلنا چاہتے ہوں۔ امید ہے اس سے معصوموں کو نصیحت ہوگی اور گنہگاروں کو عبرت۔ سب سے پہلے ہم پڑھنے والوں کو وارننگ دیں گے کہ عورت کے تعلق سے لفظ 'پیشہ' کا استعمال کرتے وقت انہیں بہت احتیاط برتنی چاہیئے۔ اس کی تاریخی وجہ یہ ہے کہ اگلے زمانے میں عورت ازدواجی زندگی کے باہر صرف ایک ہی پیشہ کر سکتی تھی۔ اس پیشے کو بظاہر نفرت اور بباطن لالچ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اب تو ہر قسم کے بورنگ پیشوں کے دروازے عورت پر کھل گئے ہیں۔ پھر بھی باعزّت عورتیں یہ سننا نہیں چاہتیں کہ وہ کوئی پیشہ کرتی ہیں۔

اب چلیئے آپ کو چند چیدہ چیدہ پیشوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔

ٹیچر یا پروفیسر:

ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ سب سے قدیم پیشہ بیسوا کا ہے، یا اُستاد کا! اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ پڑھانا پیشہ نہیں بلکہ "عدم پیشہ" ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو شخص کچھ کر سکتا ہے وہ کرتا ہے اور جو کچھ نہیں کر سکتا وہ پڑھاتا ہے لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ کچھ نہ کر سکنے کی قابلیت صرف استادوں تک ہی محدود نہیں۔ یہ خوبی بیشتر پیشوں میں ترقی پانے کے لیے ضروری ہے۔ یہ پیشہ اُن لوگوں کا من بھاتا ہے جو دوسروں سے غلامی کروانا چاہتے ہوں اور اپنی آواز سننے اور سُنانے کے شوقین ہوں۔ اس پیشے میں تنخواہ بہ ظاہر تو کم ملتی ہے لیکن اگر [illegible] کے فی گھنٹہ کے حساب سے دیکھا جائے تو بہت زیادہ ملتی ہے۔ سال میں (۷) مہینے سرکاری طور پر چھٹیاں رہتی ہیں۔ تین ماہ طلباء ہڑتال کرتے ہیں اور

دو ماہ خود ٹیچر۔ تقریباً ایک ماہ مختلف جشنوں کے لیے چھٹیاں ہو جاتی ہیں۔ اس لیے مناسب تو یہ ہے کہ استادوں کو تنخواہ دینے کی بجائے اُن سے ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر فیس لی جائے۔ کیونکہ سال میں تقریباً تیرہ ماہ انھیں چھٹیاں ہوتی ہیں۔ استاد لوگ طلباء سے بہت سی نئی چیزیں سیکھتے ہیں۔ مثلاً نئے نئے فیشن کرنا اچھے کپڑے پہننا۔ ہڑتال کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ٹیچر اور پروفیسر میں فرق گدھے اور گھوڑے کا سا ہے۔ معاف کیجئے، ان میں نہیں۔ ان کے طلبا میں۔

شاعر:

پہلے زمانے میں شاعری ایک مستند پیشہ تھا لیکن اب پارٹ ٹائم پیشہ بن گیا ہے۔ کیونکہ صرف شاعری کے سہارے کوئی اپنا پیٹ نہیں پال سکتا۔ پیٹ تو کیا کُتا اور بلّی تک نہیں پال سکتا۔ اس لیے آج کل کے شاعر، پہلے کچھ اور پالتے ہیں اور پھر شاعری پالنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ شعرا حضرات اپنے پیشے پر نادم ہوتے ہیں اس لیے ہمیشہ فرضی نام کے تحت شاعری کرتے ہیں تاکہ پکڑے نہ جائیں۔ اس لیے آپ یاد رکھیں کہ شاعر ہمیشہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا ہے۔ اکثر شاعر بہت دیانت دار ہوتے ہیں اور وہ اپنی شاعری کی کوالٹی کے مطابق اپنا تخلص رکھتے ہیں مثلاً بوگس حیدرآبادی۔ اچھے شاعر کے گھریلو حالات ہمیشہ خراب ہوتے ہیں۔ کامیاب شاعر کا ہاضمہ اور گلا اچھا ہونا چاہیئے۔ شاعر خود بہت کم لکھتے ہیں۔ عموماً ان کا درد مند دل لکھتا ہے اور وہ پڑھتے ہیں۔ کئی نئے ماڈرن شاعر آزاد شاعری کرتے ہیں لیکن اکثریت غلام شاعری کی ہے اور وہی زیادہ ہردلعزیز ہوتی ہے۔

دکان دار:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دکاندار بننے کے لیے صرف دو 'کانوں' کا ہونا ضروری

ہے۔ جسم کے کسی اور حصّے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے لوگ ایسے ہر شخص کو جس کے پاس موٹر کار نہ ہو بے کار کہتے ہیں اور جس کے پاس ہو اسے سرکار کہتے ہیں۔ ایسی غلط فہمیاں حرف پڑھے لکھے طبقہ میں پائی جاتی ہیں اور خصوصاً ایسے لوگوں میں، جن کی ماں کی "ٹنگ" اردو ہو۔

دکاندار کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان قسموں سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمیں تو چیز سستی چاہیئے اور وہ یہ لوگ دیتے نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ جو لوگ چیزیں مہنگی قیمت پر بیچتے ہیں وہ دکاندار ہیں۔ بڑے بڑے دکاندار سال میں ایک بار اپنی چیزیں سستی بیچتے ہیں۔ اس کو وہ کلیرنس سیل کا نام دیتے ہیں۔ اس کا طریقۂ کار یہ ہوتا ہے کہ پہلے تو وہ چیزوں کی قیمت میں (۲۵) فیصدی اضافہ کر دیتے ہیں پھر اس میں دس فیصدی کمی دکھاتے ہیں لوگ باگ (۱۵) فیصدی زیادہ قیمت دے کر بڑی خوشی سے بتاتے ہیں کہ وہ کس طرح لُٹ کر آئے ہیں۔

دکانیں صبح کھلتی ہیں اور شام دیر گئے کھُلی رہتی ہیں۔ اس طرح دن دھاڑے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رہتا ہے۔ انگریزی میں اس کو شاپنگ کہا جاتا ہے۔ ایسی لوٹ کھسوٹ رات کو ہو تو اس کو ڈکیتی کہتے ہیں اور اس کے لیے قید کی سزا مقرر ہے۔ دکانداروں کی لوٹ کھسوٹ کی سزا ان کی بیویوں کو بھگتنی پڑتی ہے جو دن رات گھر کی چار دیواری میں بند رہتی ہیں لیکن ان کی دلجوئی کے لئے قدرت نے ریڑھی والے اور چھابے والے مہیا کئے ہیں۔ یہ ادنیٰ قسم کے متحرک دکاندار بڑے دکانداروں کی غیر حاضری میں ان کی بیویوں کے ساتھ خرید و فروخت کرتے ہیں اور اس طرح بڑے دکانداروں کی بیویاں اور ان کے بچے بیوپار کے گُر سیکھ لیتے ہیں۔ حاصل یہ کہ دکاندار کی بیوی سے بھی بچ کر رہنا چاہیئے۔

ڈاکٹر۔ حکیم :

کسی اور کی محبوبہ کی کلائی پکڑ کر اُس کے دل کی دھڑکن سننا ہو تو یہ سب سے بہترین پیشہ ہے۔ بیماریوں کے نام لاطینی میں ہوتے ہیں۔ اب ڈاکٹروں نے علاج اور دواؤں کے نام بھی اِسی زبان میں رکھ لیئے ہیں تاکہ مریض کو کبھی معلوم نہ ہو سکے کہ ڈاکٹر کو کیا عارضہ ہے۔ پیاسوں کو چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں خالص پانی دے کہ ڈاکٹر کئی بیماریوں کا علاج کر سکتے ہیں۔ اکثر اِس پیشے میں بڑی (FRUSTRATION) محرومی اور مایوسی سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہے۔ جب ڈاکٹروں کو مریضوں کے جسم کے صرف سہلاتے پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر کی سب سے بڑی کوالی فیکیشن "اچھا ہاتھ" ہے۔ لوگ اس ڈاکٹر کو اچھا مانتے ہیں جس کا نہ صرف ہاتھ ہو بلکہ اس میں شفا بھی ہو۔ ڈاکٹر دو قسم کے ہوتے ہیں ایک PHYSICIAN، جن سے لوگ گولیاں کھاتے ہیں اور دوسرے سرجن جو بغیر گولی چلائے خون خرابہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کو "خون" معاف ہوتا ہے لیکن وہ اس حق کا استعمال اپنی بیوی کے خلاف نہیں کر سکتا۔

ایک ڈاکٹر وہ بھی ہوتے ہیں جن کو یونیورسٹی سے اعزازی ڈگری ملی ہوتی ہے لیکن وہ ڈاکٹر اصل میں مریض ہوتے ہیں۔

ڈاکٹروں میں کئی اکسپرٹ بھی ہوتے ہیں یہ لوگ کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانکاری رکھتے ہیں۔ پہلے صرف آنکھوں کے ماہر ہوتے تھے۔ اب SPECIALIZATION اتنی بڑھ گئی ہے کہ دائیں آنکھ کا ماہر بائیں آنکھ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

اس پیشے میں پیسہ خوب بنتا ہے لیکن اس کے خرچ کے لیے وقت نہیں ملتا

اس لیے کئی لوگ خود ڈاکٹر بننے کی بجائے اپنے والدین کا ڈاکٹر بننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اور حکیم میں وہی فرق ہے جو پتلون اور پاجامے میں ہے۔

وکیل

نوابی دور میں نواب زادے بٹیروں کو لڑایا کرتے تھے۔

آج کل وکیل لوگوں کو لڑاتے ہیں۔

یہ پیشہ اکثر وہ لوگ اپناتے ہیں جن کو بال کی کھال نکالنا پسند ہو۔ اس کھال کا پھر وہ ایک کالا گاؤن بنوا لیتے ہیں۔ اس گاؤن کے پہننے سے کئی عیب چھپ جاتے ہیں۔ گاؤن کا مؤنث برقعہ ہے لیکن تمام وکیلوں کی بیویوں کو برقعہ پہننا لازم نہیں۔ وکیل جو کچھ بُرا بھلا گھر میں اپنی بیویوں سے سُنتے ہیں وہی عدالت میں معصوم ملزموں کو سناتے ہیں اس سے وہ کئی بار مقدمہ جیت جاتے ہیں۔ اور اس طرح بیویوں کی نظر میں اور بھی گر جاتے ہیں۔ وکیل دو قسم کے ہوتے ہیں۔ سینیئر یعنی بوڑھا وکیل اور جونیئر یعنی اصلی وکیل جو بالآخر سینئر وکیل کا داماد بن کر اپنے انجام تک پہنچتا ہے اور اپنے سینیئر کی بیٹی سے وکالت سیکھتا ہے۔ اس پیشے میں کافی آمدنی ہوتی ہے۔ جب کوئی وکیل بہت زیادہ کمانا شروع کر دے تو سرکار اُس کی آمدنی پر تحدید عائد کرنے کے لیے اُسے جج بنا دیتی ہے۔ ڈاکٹر اور وکیل کتنے ہی ماہر ہو جائیں انہیں پیشے میں رہنے کے لیے اپنی مشق یعنی پریکٹس جاری رکھنی پڑتی ہے روزانہ پریکٹس کے باوجود ان سے غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ جہاں ڈاکٹر کی غلطیوں کو مذہب کے مطابق جلایا یا دفنا دیا جاتا ہے۔ وکیلوں کی غلطیوں کو جیل بھگتنی پڑتی ہے اور اکثر سولی پر بھی چڑھنا پڑتا ہے۔

جج :

وکیل جو جھگڑے پیدا کرتے ہیں جج اُن کا تصفیہ کرتے ہیں اس پیشے میں ایسے لوگ جاتے ہیں جن کی قوت سامعہ تیز ہو اور جو گھنٹوں اِملا لکھ سکیں۔ لوگوں کو سزا دے دے کر اُن کا دل اتنا دُکھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ماتمی کپڑے پہنے رہتے ہیں۔ ٹیچروں اور پروفیسروں کے بعد یہی ایک ایسا پیشہ ہے جس میں ہر سال چھٹیاں ملتی ہیں۔ عدالتیں پبلک کے لیے کھُلی ہوتی ہیں اور مقدموں کی شنوائی کے وقت کوئی بھی عدالت میں بیٹھ سکتا ہے صرف وکیلوں کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جو شخص جج بن جاتا ہے اس کا نام بدل دیا جاتا ہے اور اصلی نام کے بجائے اسے 'مائی لارڈ' کہہ کر پکارا جاتا ہے اس سے ججوں کو پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔ شمالی ہند کی ہندی بولنے والی ریاستوں میں مائی لارڈ کو ہندی میں مائی باپ کہتے ہیں۔ عدالت ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں توہین کے لیے جج اپنی بیوی کو سزا دے سکتا ہے۔ اسی لیے ہر شخص چاہتا ہے کہ کم از کم تھوڑی دیر کے لیے وہ جج بن جائے تاکہ اپنے دشمنوں اور خاص طور پر اپنی بیوی سے بدلہ لے سکے۔ جج اپنے فیصلے کے ساتھ کئی بار مختلف موضوعات پر ضمنی قول ——— (OBITER DICTUM) دیتے ہیں جس میں وہ موسم کی گرمی یا پانی کی کمی یا ٹرافک کی زیادتی پر یا راجیش کھنہ کی ایکٹنگ پر اپنی رائے دیتے ہیں۔ جج پھانسی کی سزا بھی دے سکتے ہیں لیکن عام طور پر لوگ اس سزا کو پسند نہیں کرتے۔

پولیس :

پولیس اس لیے رکھی جاتی ہے کہ لوگ چین کی نیند سو سکیں لیکن حیدرآباد جیسے کئی شہروں میں مچھروں کی کثرت کی وجہ سے لوگ سو نہیں پاتے اس لیے

تجویز ہے کہ پولیس کی تعداد میں کمی کر دی جائے تاکہ لوگ چین کی نیند سو سکیں۔ پولیس کا کام بہت مشکل ہے۔ چور اور ڈاکوؤں سے لے کر انہیں شرفاء تک کے ساتھ گزارہ کرنا ہوتا ہے۔ پولیس کے جن جوانوں کو ناچنے کا شوق ہو انہیں ٹرافک ڈیوٹی پر لگا دیا جاتا ہے۔ پولیس والوں کے لیے حسیناؤں پر آوازے کسنا منع ہوتا ہے لیکن وہ ان پر سیٹیاں بجا سکتے ہیں۔ اس لئے ان کو ایک ایک سیٹی بھی دی جاتی ہے۔ پولیس کی ڈیوٹی وہیں لگائی جاتی ہے جہاں کافی ہجوم ہو تاکہ پولیس پر قابو رکھا جا سکے اس لئے اکثر جلسے جلوسوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ دو چار پولیس کانسٹبلوں کے لیے دو چار سو جنتا ڈیوٹی پر ہوتی ہے۔ حکومت پولیس کے جوانوں اور افسروں کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اگر پولیس کا افسر بیمار ہو جائے تو اس کا علاج مفت کیا جاتا ہے اگر اسے کوئی پوشیدہ بیماری لگ جائے تو اُسے خفیہ پولیس میں لے لیا جاتا ہے۔

ایکٹنگ

ایکٹنگ نقل ماروں کا پیشہ ہے۔ یہ دل کی بھڑاس نکالنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ایکٹر بن کے انسان سب کچھ بن سکتا ہے۔ وکیل۔ جج۔ کلکٹر۔ راجہ ساہوکار کسان۔ ڈاکو۔ لیڈر۔ عاشق۔ اسی طرح عورت بھی ایکٹرس بن کے اپنے تمام روپ دکھا سکتی ہے۔ پہلے ایکٹر مکمل ہوا کرتے تھے

اور صرف ایسے لوگ ہی فلم سٹار بن سکتے تھے جو نہ صرف خوبصورت ہوں بلکہ گا بھی سکیں اور جن کی صحت بھی اچھی ہو۔ اب کوئی بھی شرط لازم نہیں۔ گانے کے لیے پلے بیک ہیں۔ صحت کے لیے سٹنٹ مین ہیں اور خوبصورتی کے لیے ماسک ہیں۔ اب ہر قسم کے لوگ ایکٹر بن سکتے ہیں اس لیے اس پیشہ میں بڑی مسابقت کا سامنا کرنا اور اکثر ایکٹروں کو ڈبل رول کرنا پڑتا ہے۔ اس پیشہ میں

بہت سے مقامات اور شہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ واحد پیشہ ہے جس میں کھلم کھلا
عشق و محبت کرنے والے کو بجائے سنگسار کرنے کے دولت سے مالا مال کیا جاتا ہے،
اس لیے ہر بچہ، نوجوان اور بوڑھا اس پیشہ کو اپنانا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ
اپنی جیب سے خرچ کرنے کو تیار رہتا ہے۔ ہندوستان میں فلمیں بہت مقبول ہیں۔
اور لوگوں کی مانگ ہے کہ چاہے اور سب چیزوں کی قیمت بڑھ جائے۔ لیکن فلموں
کے ٹکٹوں کی قیمت نہیں بڑھنی چاہیئے۔

آئی۔ اے۔ ایس

آئی۔ اے۔ ایس کا افسر، دھوبی کا کتّا ہوتا ہے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ کبھی
یہ کام کبھی وہ کام (آئی۔ اے۔ ایس۔ کا کام دوسروں کا کام کرنا ہے کیونکہ اس کا
اپنا کام کوئی نہیں ہوتا) یہ دراصل پیشہ نہیں ٹریننگ ہے۔ مختلف محکموں میں دو
دو۔ تین تین سال کام سکھایا جاتا ہے اور جب ایک محکمہ کا کام سیکھ لے تو اسے
دوسرے محکمہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس طرح جب اس کی ٹریننگ مکمل ہو جاتی ہے
تو اسے ریٹائر کر دیا جاتا ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ٹریننگ اس کے اگلے جنم میں
کام آئے گی۔ جہاں ٹیچروں اور پروفیسروں کو بہت زیادہ تنخواہ ملتی ہے وہاں آئی اے ایس
کے افسروں کو بہت کم تنخواہ ملتی ہے اس لیے عام آئی اے ایس افسر بہت غریب ہوتا ہے۔ نہ صرف
وہ خود غریب ہوتا ہے بلکہ اس کی بیوی بھی غریب ہوتی ہے۔ اس کے بچے غریب ہوتے ہیں، اس
کی ماما غریب ہوتی ہے، اس کے نوکر غریب ہوتے ہیں، اس کا شوفر غریب ہوتا ہے، اس کا چوکیدار
غریب ہوتا ہے اور اس کا کتا غریب ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کا ملک بھی غریب ہوتا ہے۔

جیسا کہ کہا گیا ہے۔ اکسپرٹ لوگ کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ
جانتے ہیں۔ اس کے برعکس آئی۔ اے۔ یس افسر زیادہ سے زیادہ کے بارے میں کم سے کم

جانتے ہیں۔ اس طرح سے بہترین آئی۔اے۔یس افسر وہ ہے جو ساری دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ چونکہ یہ لوگ کچھ نہیں جانتے اس لیے ان میں تعصب نہیں ہوتا عموماً آئی۔اے۔یس کے افسر اہم عہدوں پر مقرر ہوتے ہیں اس لیے سرکار چاہتی ہے کہ بلالحاظ مذہب و ملّت سب لوگوں کو ایک آنکھ سے دیکھیں اس لیے اب یہ فیصلہ تھا کہ اس سروس میں نئی بھرتی کے لیے کانے لوگوں کو ترجیح دی جائے گی۔ لیکن اس فیصلہ کے بارے میں سُن کر بہرے، لنگڑے اور دوسرے معذور لوگوں نے بھی مانگ پیش کی ہے کہ ان کے لیے بھی کچھ فیصد کوٹا ریزرو کیا جائے حکومت اب اس فیصلہ پر نظر ثانی کر رہی ہے۔

حضرات اب آپ فیصلہ کر لیجئے کہ آپ کون سا پیشہ کرنا چاہتے ہیں۔

چہرے اور نام

ہر چہرے کا نام ہوتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا، اگر نام نہ ہوتا۔ اس طرح اگر چہرہ پہچان لیا جاتا تو کام بن جاتا۔ اب نہ صرف چہرہ پہچاننا پڑتا ہے بلکہ اس کا نام بھی یاد کرنا پڑتا ہے یعنی یادداشت پر دوہرا بوجھ پڑتا ہے۔

اکثر لوگ کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ انسان صرف غیر ضروری نام ہی بھولتا ہے۔ کبھی کسی اہم شخص کا نام نہیں بھولا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا تو کیا لوگ اس کے والدین، اس کے بچوں، رشتہ داروں اور آشناؤں، اس کے ملازموں اور حتیٰ کہ اس کے کتّے تک کا نام یاد رکھتے ہیں۔

چھوٹا یا کم اہم آدمی: "آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ میں آپ سے فلاں صاحب کے گھر ملا تھا۔"

بڑا یا اہم آدمی: "جی ہاں۔ آپ کا چہرہ تو پہچانا ہوا ہے، لیکن معاف کیجئے، آپ کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔"

اس پر وہ شخص جھٹ اپنا نام بتا دیتا ہے۔

ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہمیں نام تو یاد رہتے ہیں، لیکن چہرے بھول جاتے ہیں اور پھر ہم کسی کو یہ کہہ کر کہ ہمیں آپ کا نام یاد نہیں، اس کا دل توڑنا نہیں چاہتے۔ ہماری مڈبھیڑ اگر کسی ایسے شخص سے ہو جائے تو ہم کہتے ہیں "معاف کیجئے آپ کا نام تو مجھے یاد ہے لیکن آپ کا چہرہ نہیں پہچان پایا۔"

"جی — اس ناچیز کو غلام احمد کہتے ہیں۔"

ایک بار ایسے ہی حالات میں ایک مدراسی صاحب سے ملاقات ہوئی ہم نے وہی جملہ دہرایا۔

اس نے جواب دیا۔

"جی — مجھے رام کرشنا کہتے ہیں۔"

میں نے اُن کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور کہا "چہرہ آپ کا ایک ہے اور نام دو۔ اس لیے کچھ کنفیوژن ہو گیا تھا۔ میں نے رام اور کرشن دونوں کی تصویریں دیکھی ہوئی ہیں — اور یہی سوچ رہا تھا کہ آپ اُن میں سے کون ہیں۔ لیکن یہ خیال میرے ذہن میں نہیں آیا کہ آپ دونوں ہی ہو سکتے ہیں۔"

وہ صاحب ہنس پڑے "میرا پورا نام تو سیتا رام کرشنا ہے۔"

"اوہو — تو — لیکن آپ کے اتنے چھوٹے سے چہرے پر یہ تین نام کیسے چسپاں ہو سکتے ہیں۔؟"

امریکن ماہرین کا کہنا ہے کہ دنیا میں صرف وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو دوسروں کے نام یاد رکھ سکے۔ بے شمار کتابیں، لوگوں کے نام یاد رکھنے

کے گُر بتاتی ہیں مثلاً کسی سے تعارف ہو تو رسمی طور پر ہیلو کہنے کی بجائے اُس کا نام دوبارہ پوچھو۔ اِس کے بعد اُس کے ہجے پوچھو۔ اس کے بعد ممکن ہو تو نام کا مطلب پوچھو۔ اس طرح نام یاد رکھنے میں مدد ملتی ہے، لیکن اتنی تفصیل میں جانے سے تو آپ، صرف دو چار نام ہی یاد رکھ سکتے ہیں۔ ہم نے مغلیہ خاندان کے بادشاہوں کے نام ایسے ہی یاد کئے تھے لیکن سوشل زندگی میں اس گُر سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔

ایک بار ایک پارٹی میں جب ہمارا تعارف چند اصحاب کے ساتھ ہو رہا تھا تو ہم نے اسی گُر کے مطابق ہر شخص کا نام دو دو بار پوچھا۔ نتیجتاً جب تعارف پورے ہو چکے تو ہم ہر نام دو دو بار بھول چکے تھے۔ اس کا ایک اور نتیجہ نکلا کہ ہم نے ایک شخص کو دوسرے سے سرگوشی کے انداز میں کہتے سُنا کہ یہ شخص شاید بہرہ ہے۔ ہر ایک کا نام دوبارہ پوچھ رہا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ وہ شخص سرگوشی بھی بڑے اطمینان سے ہمارے سامنے ہی کر رہا تھا، کیونکہ اُسے یقین تھا کہ ہم سُن نہیں سکتے۔

جب ایسے کوئی فائدہ نہ ہوا تو ہم نے فارمولے کا دوسرا حصّہ آزمایا۔ ہم نے ایک شخص سے پوچھا "آپ اپنے نام کے ہجے کیا کرتے ہیں؟"

اُس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "جیسے سب لوگ کرتے ہیں!"

ہم نے جھینپ کر کہا "نہیں صاحب ایسا ہے کہ مختلف لوگ اپنا نام مختلف طریقوں سے لکھتے ہیں اس لیے میں پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ اپنا نام کیسے لکھتے ہیں؟"

اُس نے قدرے خوشی سے پوچھا "آپ کیسے لکھیں گے میرا نام؟"

ہم اپنا سا مُنہ لے کر آگے چل پڑے۔ بعد میں پتا چلا کہ اُس شخص کا نام

رام تھا اور رام صرف ایک ہی طریقے سے لکھا جا سکتا ہے۔

پھر ہم نے ایک اور صاحب کے ساتھ قسمت آزمائی کی۔

"آپ کے نام کا مطلب کیا نکلتا ہے؟"

"وہ جو رات کے وقت جاگتا ہے اور دن کے وقت سوتا ہے۔"

ہم اچنبھے میں پڑ گئے۔ وضاحت سے اور کافی حد تک چہرے سے اُن کا نام اُلّو ہونا چاہیئے تھا لیکن ہمیں آج تک کوئی ایسا اُلّو نہیں مِلا۔ جس نے اپنا نام دیانت داری کے ساتھ بتایا ہو۔

ہم نے ہار مان کر کہا "ہماری سمجھ میں نہیں آیا"

"ہمارا نام 'چاند میاں' ہے" وہ مسکرا کر بولے

"ہم تو کچھ اور ہی سمجھے تھے"

"جی ہاں کئی لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ میرے گنجے پن کی طرف اشارہ ہے۔ ویسے میں پیدا ہی گنجا ہوا تھا" اور یہ کہہ کر وہ خوب زور سے ہنسنے لگے، جیسے اب آپ لوگ ہنس رہے ہیں۔

ویسے ایک ایسا بھی گُر ہے جس سے نام یاد رکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ آپ سکھ کو سردار صاحب۔ ہندو کو رائے صاحب اور مسلمان کو خان صاحب کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ اس سے نام یاد رکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی اور وہ لوگ خوش بھی ہو جائیں گے۔ انگریزی سرکار ہمیشہ اسی طرح اپنی رعایا کو خوش رکھتی تھی۔ لیکن ایسا کرنے کے لیے آپ کو یہ پتہ کرنا پڑتا ہے کہ فلاں صاحب کا مذہب کیا ہے۔ شمال میں ہندو اور مسلمان کے فرق کا ایک میل سے پتہ لگ جاتا ہے لیکن جنوب میں یہ لوگ کچھ ایسے گھُل مِل گئے ہیں کہ کچھ پتہ نہیں لگتا کہ کون خان صاحب

ہیں اور کون رائے صاحب، یہ کنفیوژن عورتوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے،
اگر کوئی عورت آپ کو سلیقے سے آداب کرے، بات بات میں خدا کی قسم کھائے اور
وداع ہوتے وقت خداحافظ کہے تو وہ لکشمی دیوی راج نکلتی ہے اور اگر
کوئی حسینہ ماتھے پہ بندیا لگا کر پھرتی ہو اور ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرے تو وہ
عائشہ بیگم اِسی لیے کہتے ہیں عورتوں کا اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ ویسے یہ دکن
کی مٹی کی خاص بات ہے۔ یہاں مذہب، مذہب میں۔ فرقہ، فرقہ میں اور یہاں
تک کہ جنس جنس میں فرق مٹ گیا ہے۔ یہاں سب لوگ ایک ہی قسم کے
دکھائی دیتے ہیں۔

اکثر علاقوں میں لوگوں کے نام عام طور پر کسی دیوی یا دیوتا یا مزار پہ رکھے
جاتے ہیں۔ مثلاً وشاکھاپٹنم میں اگر آپ ریل کے کسی تھرڈ کلاس ڈبّے کے اندر
جھانک نرسمہا کہہ کر پکاریں تو سارے کا سارا ڈبّہ آپ کو لبیک کہے گا۔ بھونگیر
تعلقہ اور نلگنڈہ ضلع میں اگر آپ "یادگیری" کا نام زور سے لے لیں تو بس کے اندر
سے سب لوگ آپ کی طرف لپک پڑیں گے۔ لالہ گوڑہ کے محلے میں اگر آپ اونچی
آواز میں ٹام یا جم کہہ دیں تو نہ صرف پانچ چھ نوجوان بلکہ آٹھ دس کتّے بھی
اپنی دُم ہلاتے ہوئے آپ کے اِردگرد جمع ہوجائیں گے۔ ہاں اگر آپ الزبتھ یا
میری کا نام پکاریں تو صرف لڑکیاں ہی مٹکتی ہوئی "ہائے" "ہائے" کرتی ہوئی
آپ کا ماتم کرنے کے لیے جمع ہوجائیں گی۔ یہ لفظ "ہائے" آج کل بہت مقبول
ہوگیا ہے۔ پہلے صرف کسی کے مرنے پر لوگ ہائے ہائے کرتے تھے۔ آج کل جب
نوجوان آپس میں ملتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ان کو کوئی خوشی نہیں ہوتی، بلکہ غم
ہوتا ہے۔ اِسی لیے ہائے ہائے کہہ کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ مزدور لوگ

جب ہڑتال کرتے ہیں تب بھی ہائے ہائے کرتے ہیں۔ ابھی چند ہی دنوں کی بات ہے کہ مزدوروں کے ایک ہجوم نے ہمارے دفتر کے سامنے آکر نعرے لگانے شروع کیے "ہائے ہائے کیا ہوا؟ نریندر لوتھر مر گیا!" ہمیں اس بات کی مطلق خبر نہ تھی کہ ہم انتقال کر چکے ہیں۔ یہ بھی ستم ظریفی کی حد ہے کہ ہم مر گئے اور دوسرے لوگ ہمیں بتا رہے ہیں۔ بہرحال اِس خبر کی توثیق کے لیے ہم نے گھر فون کیا۔ بیگم نے فون اٹھایا، ہم نے پوچھا ــــ

"ہمارا کیا حال ہے؟"

"ہمیں کیا معلوم۔ بلدیہ کے لوگوں سے پوچھو۔ جہاں سارا دن جھک مارتے رہتے ہو۔"

"یہ لوگ تو کہتے ہیں کہ میں مر گیا ہوں"

"شکر ہے خدا کا۔"

یہ کیا؟ ــــ بیوی خاوند کی موت پر خدا کا شکر ادا کر رہی ہے۔ یہ تو واقعی ڈوب مرنے والی بات ہے (بیوی کے لیے، خاوند کے لیے نہیں؟ کیونکہ وہ تو پہلے ہی مر چکا ہے)

"جی ہاں! شکر ہے خدا کا۔ اگر آپ لوگوں کے لیے مر گئے تو پھر ہمیں امید ہے کہ اپنے گھر والوں کے لیے زندہ ہو جائیں گے۔"

ہمارے خیال میں مزدوروں کو کسی نے غلط خبر دے دی تھی۔ بقول شخصے یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی۔ ہم نے ان کو بلایا اور یقین دلایا کہ ہم زندہ ہیں اور انھیں ابھی اتنا ماتم کرنے کی ضرورت نہیں۔ تب وہ لوگ خدا کا شکر بجا لائے اور خوش خوش اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

ہندوستان کے تمام فرقوں میں پارسیوں کے نام سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ یاد رکھے جاسکتے ہیں بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھیں یاد رکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ عام طور پر ان کے نام ان کے گاؤں یا پیشہ پر رکھے جاتے ہیں مثلاً — تاراپور والا "تاراپور" سے اور مالیگاؤں والا "مالیگاؤں" سے آیا ہوگا اور گوروالا قبرستان کی طرف جانے والا ہوگا۔ اگر آپ کسی پارسی سے دھول پیٹ میں ملیں تو اس کا نام دھول پیٹ والا ہوگا۔ اگر وہ بالٹی بناتا ہے تو وہ بالٹی والا ہوگا۔ ایک پارسی، بلدیہ کے ہیڈ آفس میں کام کرتا ہے اور لالہ پیٹ میں رہتا ہے۔ دن کے وقت سب لوگ اُسے "بلدیہ والا" کہتے ہیں۔ لیکن جب شام کو گھر جاتا ہے وہ لالہ پیٹ والا بن جاتا ہے۔

ایک بار ہمیں ایک پارسی بچے کی نوجوت رسم پر متعدد پارسیوں سے ایک پارٹی میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں جاکر ان کے ناموں سے پتا چلا کہ دنیا میں انواع و اقسام کے پیشے ہیں۔ مہمانوں میں سے ایک شخص کرسی پر بیٹھا ہوا تھا ہم فوراً اُس کے پاس گئے اور "ہیلو مسٹر! کرسی والا" کہا۔ وہ مسکرا کر اُٹھا اور بڑے تپاک سے ہمارے ساتھ ہاتھ ملایا۔ چند اور لوگوں سے ملنے کے بعد جب ہم پھر اُس کرسی کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ شخص کرسی چھوڑ کر کھڑا ہوا تھا اور آئسکریم کھا رہا تھا۔ ہم نے مسکرا کر کہا۔

"ہیلو مسٹر آئسکریم والا"

وہ شخص ہماری بات کاٹ کر بولا "غالباً آپ کو کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے۔ آئسکریم والا میرا بہنوئی ہے اور وہ سامنے کھڑا پکوڑے کھا رہا ہے۔ میرا نام پکوڑا والا ہے۔" ہم حیران و پریشان۔ یہ پارسیوں کو کیا ہوگیا۔ نام آئسکریم والا اور کھا پکوڑے

رہا ہے۔ اور پکوڑے والا آئسکریم کھا رہا ہے، ایسا کیسا جی! پارسیوں کو تین اور ناموں کا بڑا شوق ہے بہرام اس کا بیٹا رستم، اور پھر اس کا بیٹا سہراب۔ شکر ہے سہراب کا بیٹا نہیں ہوا۔ نہیں تو پارسیوں کو ایک اور نام مل جاتا۔ یہ فارسی نام ہیں ان کے ساتھ "جی" لگا کر ان کو ہندوستانی نام بنا دیا جاتا ہے۔ پارسی لوگ بڑے باادب اور اصولی واقع ہوئے ہیں۔ احتیاطاً ہر نام کے ساتھ "جی" لگا دیتے ہیں تاکہ اگر غصّہ میں بھی نام لیا جائے تو کسی کی ہتک نہ ہو۔

ناموں کے بارے میں سکھ لوگ بڑے کم خرچ واقع ہوئے ہیں، ہر سکھ کے نام کے دو حصّے ہوتے ہیں اور دوسرا حصّہ ہمیشہ سنگھ ہوتا ہے سنگھ کے معنی "شیر" ہیں۔ شیر ویسے تو ہندوستان میں بڑا پاپولر جانور ہے، لیکن پنجاب میں اسے خاص طور پر پسند کیا جاتا ہے۔ حالانکہ سکھوں میں شیر کے علاوہ دوسرے جانوروں کی خصلت کے انسان بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن دوسری قسم کے جانوروں کے نام ابھی لوگوں نے اپنانے شروع نہیں کئے ہیں۔

اگر کسی سے لڑائی جھگڑا ہو جائے تو ایسے نام دوسروں کو بڑی سخاوت سے آفر کئے جاتے ہیں۔ ہاں بیشتر لڑکیوں کا نام بلّی رکھا جاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو کر عورتیں بن جاتی ہیں تب بھی یہ نام اُن کا ساتھ دیتا ہے۔ جن عورتوں کا نام بلّی ہو، اُن سے دور ہی رہنا اچھا ہے کیونکہ وہ دودھ ملائی خوب کھاتی اور موقع ملنے پر ناخنوں سے نوچتی بھی خوب ہیں۔ سکھوں میں عورتوں اور مردوں کے نام ایک ہی ہوتے ہیں مثلاً آدمی اگر شیر سنگھ ہے تو عورت شیر کور۔ آدمی اگر دلجیت سنگھ ہے تو عورت دلجیت کور۔ ہمیں ایک بار شادی کا رقعہ ملا جس میں لکھا تھا کہ ظالم سنگھ کی شادی مہربان کور سے ہو رہی ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ

اگر مرد ظالم ہو اور عورت مہربان تو ازدواجی زندگی یقیناً نہایت کامیاب رہے گی۔
جنوب کے لوگ خصوصاً مدراسی۔ ملیالی اور آندھرائی ناموں کے بارے میں بڑے فضول
خرچ مگر دُور بین واقع ہوئے ہیں۔ شمال میں اگر راج گوپال نام کافی سمجھا جاتا ہے
تو جنوب میں وہی نام ویلور وکرشنا سوامی۔ ستیم پاٹو۔ راج گوپالن بن جاتا ہے
اگر اس نام کی اردو میں تشریح کی جائے تو یہ ہوگی۔ راج گوپالن ولد کرشنا سوامی
سکونت ویلور، ذات برہمن یعنی یہ نام گویا خاندان کے شجرۂ ونسب کا چلتا پھرتا
رجسٹر ہے۔ دراصل جنوبی ہند میں اپنے نام کے ساتھ باپ کا نام اور گاؤں کا نام
بھی لگایا جاتا ہے، اس طرح گم شدہ کی تلاش میں آسانی رہتی ہے۔ اگر کوئی ایسا
شخص چوری بھی کرے تو اُسے پکڑنے میں آسانی رہتی ہے کیونکہ اُس کا پوسٹل ایڈریس
اور اس کے آبا واجداد کا نام ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ اس لیے جنوبی ہند میں کم لوگ
چور ہوتے ہیں۔

جب ہمارا پہلا بچّہ پیدا ہوا تو ہم وشاکھا پٹنم میں تھے۔ وہ پونگل کے تہوار
کے دن پیدا ہوا تھا اور وشاکھاپٹنم میں اکثریت "راؤ" کے نام کی ہے اس لیے روایت
کی رُو سے ہم نے اُس کا نام ین۔ وی۔ پونگل راؤ رکھا۔ یعنی نریندر (ہمارا نام)،
وی، وشاکھاپٹنم (شہر کا نام) پونگل (تہوار کا نام) راؤ۔ اُس کے بعد ہمارا تبادلہ نیلور
ضلع میں ہوا تو ہم نے دیکھا کہ وہاں راؤ اِکّے دُکّے شخص کا نام تھا۔ اکثریت ریڈی
لوگوں کی تھی۔ ہم نے عاقبت، اسی میں سمجھی کہ اُس کا نام راؤ سے بدل کر ریڈی کردیا
جائے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اُس کے بعد ہمارا تبادلہ حیدرآباد ہوگیا۔ اب یہ مسئلہ پیدا
ہوا کہ حیدرآباد میں تو بے شمار ذاتوں اور نسبوں کے لوگ ہیں۔ اب کتنے نام بدلیں۔
بیگم نے مشورہ دیا کہ ایسے کام نہیں چلے گا، بہتر ہے کہ ہر شہر میں ایک بچّہ پیدا

کیا جائے اور اُس پہ اُس کا نام رکھا جائے۔ شاید بیگم کے ارادوں کی حکومت کو بھی خبر ہو گئی۔ اُس دن سے آج تک حکومت نے میرا تبادلہ کہیں نہیں کیا۔ اس طرح ہماری خاندانی منصوبہ بندی ہوئی۔ ہم نے بھی پالیسی بدل لی ہے لیکن پھر بھی ڈر رہتا ہے کہ اب اِس عمر میں کہیں اور تبادلہ نہ ہو جائے۔ ذرا آپ سوچیئے۔ صرف آندھرا پردیش کے ہی اکیس اضلاع ہیں۔

خیر ہم اصل موضوع سے کچھ ہٹ گئے۔ بات ناموں اور چہروں کی ہو رہی تھی اور ہم نے یہ رائے دی تھی کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر صرف چہرے ہوتے اُن کا نام نہ ہوتا۔

لوگ نام کی طرف جاتے ہیں، جو دیا جاتا ہے — بدلا جا سکتا ہے — ہم چہرے کی طرف جاتے ہیں جس کے ساتھ انسان پیدا ہوتا ہے جو بدلا نہیں جا سکتا جو ہمیشہ وہی رہتا ہے۔ اس لیے چہرہ یاد رکھنا آسان ہوتا ہے۔ انسان کا چہرہ ایک ہوتا ہے۔ کرشن چندر۔ جوزف۔ بہرام جی۔ غلام احمد۔ راجندر سنگھ۔ یہ سب نام جُدا جُدا ہیں۔ لیکن، ان کا چہرہ ایک ہی ہے۔ انسان کا چہرہ۔ ہمیں صرف وہی یاد رہتا ہے۔ نام سے تفریق پیدا ہوتی ہے۔ ہم اسے بھُول جاتے ہیں لیکن اگر نام یا چہرے میں سے ایک چیز بھی آپ بھُول گئے تو لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ آپ نام بھول گئے۔

■■

احساسِ مسرّت

جوشؔ ملیح آبادی کی ایک رباعی ہے :-

غنچے تیری زندگی پہ دل ہلتا ہے
بس ایک تبسّم کے لیے کِھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا
یہ ایک تبسّم بھی کِسے مِلتا ہے

تبسّم علامت ہے مسرّت کی۔ مسرّت ایک اندرونی کیفیت ہے اور تبسّم اس کا اظہار۔

ضروری نہیں کہ ہر مسرت کا اظہار تبسّم میں ہو۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر تبسّم مسرّت کا مظہر ہو۔ تہذیب نے انسان کو اپنے جذبات اور ان کے اظہار پر قابو پانا سکھایا ہے اور صدیوں کی کاوشوں کے بعد آج کا انسان اتنا مہذب ہوگیا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے جذبات کے اظہار کے قابل نہیں رہا بلکہ اکثر وہ خود اپنے جذبات کو پہچان بھی نہیں پاتا۔

ہم بھی مہذب بلکہ بہت ہی مہذب شخص ہیں۔ جذبات سے عاری ہو چکے ہیں تو ان کے اظہار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ایک تو ہم ویسے ہی مہذب اور دوسرے نہایت ہی سوبر قسم کی سروس میں داخل ہو گئے۔ بس گویا سونے پر سہاگہ۔

جب ہم پچیس برس کے ہوئے تو ہمیں بتایا گیا کہ اب تم سیانے ہو گئے ہو۔ ہنسنا ہنسانا چھوڑ دو۔ یہ بچوں کا کام ہے۔ سیانے لوگوں کو ایسی باتیں شوبھا نہیں دیتیں۔ مہذب شخص تابعدار ہوتا ہے۔ ہم حکم بجا لائے اور ہنسنا چھوڑ دیا۔ اور اس کے بجائے مسکرانا شروع کر دیا۔ جہاں پہلے ہم خوب زور سے قہقہے لگاتے تھے، اب مسکرانے پر ہی اکتفا کرنے لگے۔ ہماری حالت بجلی کے اس پنکھے کی سی ہو گئی جس کی وولٹیج کم ہو گئی ہو۔ اسے آپ چاہے کتنے ہی نمبر پر چلائیں وہ دھیمی رفتار سے ہی چلتا ہے اگر کوئی ہم سے پوچھتا کہ ہم نے ہنسنا کیوں چھوڑ دیا تو ہم پروٹسٹ کرتے کہ یہ محض الزام تراشی ہے۔ ہم تو کبھی ہنستے ہی نہیں تھے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کوئی ایسا ثبوت یا گواہ پیش کریں جس سے آپ کے الزام کی تصدیق ہو سکے۔ ہم نے یہاں تک بھی آفر کیا کہ آپ ہماری بیگم سے پوچھ لیں کہ آیا انھوں نے ہمیں کبھی ہنستے ہوئے دیکھا ہے۔ بیگم ہمیں بہت سی حالتوں میں دیکھ چکی ہیں۔ بہت سی کیفیتوں سے گزرتا ہوا پا چکی ہیں۔ لیکن وہ حلفیہ بیان دینے کو تیار تھیں کہ انھوں نے ہمیں کبھی ایسی بے ہودہ حرکت کرتے ہوئے نہیں پایا۔ ہاں ایک بار ہمیں، رات کو نیند میں ہنستے ہوئے پکڑا گیا۔ ہم خواب دیکھ رہے تھے کہ ہنسنے کا مقابلہ ہو رہا ہے اور اس میں ہمیں فرسٹ پرائز ملا ہے۔ لیکن بیگم نے ہمیں جھنجھوڑ کر اس حسین خواب سے بیدار کر دیا اور کہنے لگیں "ہائے میں تو ڈر ہی گئی تھی"۔

اس کے بعد جب ہمیں ترقی ملی تو ہمارے افسر نے ہمیں بلا کر کہا کہ اب تم ایک

ذمّہ دار عہدہ سنبھالنے جا رہے ہو۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ مسکرا کر بات کرتے ہو۔ اس سے عہدے کے وقار کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ مسکرانا کم کر دو۔ ہو سکے تو بالکل چھوڑ دو۔ ہم مہذب شخص ہیں اور مہذب شخص تابعدار ہوتا ہے۔ اس لئے ترقی پانے کے دن ہم نے مسکرانے کا سوئچ آف کر دیا۔

اب گویا ہم ایک زیرو پاور کا بلب بن گئے جو کبھی جلتا بھی تھا تو LOW وولٹیج پر۔

اس کے ساتھ ہم نے لوگوں کے ساتھ مصافحہ کرنا بھی بند کر دیا کیوں کہ ہاتھ ملاتے وقت کبھی کبھی ہونٹوں پر مسکراہٹ آجانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ہماری یہ خواہش تھی کہ ہم کامیاب افسر ثابت ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ ترقی پاتے جائیں۔ اس کے لئے مسکرانا چھوڑنا اگر شرط تھی تو یہ بڑی معمولی بات تھی۔

اب ہماری یہ حالت تھی کہ ہمیں ہر ہنستا ہوا شخص اُجڈ، جاہل لگتا اور ہر مسکراتا ہوا انسان پچھڑے ہوئے طبقے کا ممبر، بڑا احمق۔ ایسے لوگوں کی صحبت سے ہمیں کوفت ہونے لگی۔ اب ہمیں شادی بیاہ کی تقریبوں میں شرکت کرنے کی بجائے ماتمی جلسے اور سوگوار لوگ زیادہ بھلانے۔ ہندوستانی بیوی تو خاوند کا رجحان دیکھتی ہے۔ بیگم نے ہماری مسکان غائب ہوتے دیکھی تو سمجھ گیئں کہ رتبے اور سینیارٹی کا سوال ہے۔ انھوں نے بھی اپنا چہرہ سوگوار بنا لیا۔ ویسے اُن میں شروع ہی سے اعلیٰ افسری کے بہت سے لچھن پائے جاتے تھے۔ بڑے خربوزوں کو دیکھ کر چھوٹوں نے رنگ پکڑا۔ اور بچے بھی سنجیدہ ہوتے گئے۔ ویسے ہمیں شک تھا کہ ہماری غیر حاضری میں ہمارے گھر میں کچھ ہنسنا ہنسانا ہوتا ہے۔ لیکن اپنے غیاب میں ہونے والی تخریبی کاروائیوں کو روکنا آسان نہیں۔ اتنا ہی کافی تھا کہ ہماری موجودگی میں کوئی ایسی نازیبا

حرکت سرزد نہیں ہوتی تھی۔

ایک بار جو ہم گھر میں داخل ہوئے تو قہقہوں کی آواز اور ہنسی کی جھنکار کانوں میں پڑی۔ ہم ایک دم رُک گئے۔ سمجھے کہ غلطی سے کسی دوسرے کے گھر آگئے ہیں اُلٹے پاؤں باہر گئے۔ بورڈ پڑھا تو اپنا ہی نام تھا۔ سیدھے پاؤں پھر واپس آئے۔ معمول کی خاموشی تھی ماحول سوگوار تھا۔ اطمینان ہوا۔ اندر آگئے۔ کمرے میں کچھ مسکراہٹ کے بکھرے نشان دکھائی دیئے۔ ہاں ایسا لگتا تھا کہ سب سے چھوٹا بچہ ابھی ابھی ہنسا ہوگا جس کے نتیجہ میں بڑے بچوّں کے چہروں پر مسکراہٹ کی رہی ٹریٹ کے آثار رہ تھے۔ بیگم کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے پر وہی "سوگوار آمدید" تھی جس کے ہم عادی ہو چکے تھے۔ ہم نے سختی سے پوچھا کہ اس گھر سے ابھی ابھی جو قہقہوں کی گونج اُٹھی تھی اس کی کیا وجہ تھی۔ سب بچّے خاموش رہے، لیکن سب سے چھوٹا بچہّ ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ ابھی ریڈیو پر ڈرامہ پیش ہو رہا تھا۔ بڑا ہی ہنسانے والا تھا۔ بس تو ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ ہمیں بڑا دکھ ہوا۔ اتنی چھوٹی عمر اور اتنا ہنسنا۔ یہ آثار اچھے نہیں۔ بیگم نے صفائی دی کہ قہقہے صرف ریڈیو سے آرہے تھے۔ بچّے تو صرف مسکرا رہے تھے۔ صرف سب سے چھوٹے بچّے نے ہنسنے کا جرم کیا تھا۔ یہ کہتے کہتے بیگم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ہم نے اپنی آخری اولاد کو گود میں لیا اور سمجھایا کہ بیٹے تم ایک مہذب شخص کی اولاد ہو۔ تم دوسری نسل کے مہذّب شخص ہو اور پھر تمہیں بھی بڑا شخص بننا ہے ترقی کرنی ہے۔ اگر ہنسنے اور مسکرانے کی بُری عادت نہ چھوڑی تو سب لوگ کہیں گے کہ یہ کیسا چھچھورا آدمی ہے۔ اونچے حلقوں میں کوئی تم سے بات نہیں کرے گا۔ تم پر ترقی کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ تمہارا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ کبھی ہمارے

ملنے جلنے والوں کو تم نے مسکراتے دیکھا ہے ؟

اگر زندگی میں تمہیں کچھ بننا ہے تو ہنسنا چھوڑ دو۔ جتنی جلدی یہ بات پلّے باندھ لو اُتنا ہی اچھا ہے۔ تم ہونہار ہو بس اتنی سی بات اور سیکھ لو۔

بچّہ یہ سُن کر ہماری گود سے اُتر کر باہر بھاگ گیا اور ہمیں ایسا لگا کہ باہر دور سے بچوں کے ہنسنے کی آوازیں آرہی ہیں۔

چھ سال اور بیت گئے۔ ہمیں ایک اور ترقی ملی۔ اس بار ہمیں کسی نے بتایا نہیں لیکن ہم نے خود ہی ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اپنے آفس کے دروازے پر بورڈ لگا دیا۔" اندر مسکرانا منع ہے۔ ہنسوڑ قسم کے لوگ اپنے ماسک اُتار کر آئیں۔" اب ہمارے جبڑے سخت ہوگئے ہیں۔ دانت کسے رہتے ہیں چہرے پہ ماتم چھایا رہتا ہے۔ ہم ہر آنے والے کو برفانی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ کا عنصر نچوڑ کر، اسے پَرے پھینک کر، پھر اس سے بات کرتے ہیں۔ اب لوگوں کو مہذب بنانا اور ہنسی اور مسکراہٹ جیسے مکروہ افعال کو ختم کرنا ہی ہماری زندگی کا مشن بن گیا ہے جہاں ہم ہوں وہاں میلوں تک چاروں طرف ہنسی اور مسکراہٹ پھٹک نہیں سکتی۔ اب کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس نے ہمیں کبھی مسکراتے دیکھا ہو۔ سنجیدگی اور سوگواری کے لئے ہمارا ریپوٹیشن اتنا ہوگیا ہے کہ دُور دراز سے ہمیں ماتمی جلسوں میں مدعو کیا جاتا ہے۔ تعزیتی تقریروں کے لئے ہم موزوں ترین شخص سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے سامنے آتے ہی بڑے بڑے پھکڑوں کا منہ لٹک جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں جب ہمارا تعارف کرایا گیا کہ موصوف بہت سینئر افسر اور نہایت ہی کامیاب شخص ہیں تو ملنے والے شخص نے فوراً جواب دیا۔ "جی، وہ تو ظاہر ہے۔" ایک بار چند منچلوں نے غلطی سے ہمیں ایک جشنِ ظرافت میں

بحیثیت مہمان خصوصی بُلایا۔ اس کا اثر ہوا کہ بڑے بڑے مزاح نگار اور لطیفہ گو ہُوٹ کردیئے گئے۔

لیکن ابھی پرسوں کی ہی بات ہے۔ ہمارا سب سے چھوٹا بچہ جو سات سال کا ہے گھر دیر سے آیا اور قہقہے لگاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں افراتفری مچ گئی جیسے شیشے کی دکان میں بیل آگیا ہو۔ بیگم نے چیختے ہوئے اس کو گود میں لے لیا اور ٹٹولنے لگی۔ "کیا ہوا کیا ہوا؟" بڑی بیٹی نے اس کا معائنہ شروع کردیا کہ کسی پاگل کتّے نے تو نہیں کاٹ لیا۔ وہ زبردستی اپنے آپ کو چھڑاتا ہوا ہمارے پاس بھاگ کر آیا۔ ابھی تک وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ہم نے اس کو پچکارا اور پوچھا "کیا بات ہے بیٹا؟"

جواب میں اس نے پوچھا "آپ جانور ہیں پاپا؟"

ایسی بدتمیزی اس گھر میں پہلی بار ہو رہی تھی۔

ہم نے اپنے آپ کو بمشکل کنٹرول میں رکھ کر کہا

"کیا مطلب ہے تمھارا۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

بچّے نے کہا "ہمارے ماسٹر جی کہہ رہے تھے کہ انسان اور جانور میں یہ فرق ہے کہ جانور ہنس نہیں سکتا۔ یہ سُن کر ساری کلاس ہنس پڑی سوائے میرے۔ اس پر ساری کلاس نے ہمیں چھیڑنا شروع کردیا۔ "ڈبو جانور ہے"۔ "ڈبو جانور ہے"۔

پھر ہمارے ماسٹر جی آئے اور کہنے لگے۔

"ہنسو بیٹا۔ تم ہنستے کیوں نہیں؟

ہم نے جواب دیا "بابا کہتے ہیں صرف جاہل اور بدتمیز لوگ ہی ہنستے ہیں"۔

یہ سُن کر ماسٹر جی اور تمام بچّے زور زور سے ہنسنے لگے۔ میں پہلے تو رونے لگا،

پھر مجھے جو ہنسی آئی تو قابو میں ہی نہیں آئی۔

ڈبّو نے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے پھر پوچھا۔

"سچ بتایئے پاپا آپ، انسان ہیں کہ جانور؟"

یہ سن کر ہمیں اچانک ایسی ہنسی آئی کہ گھر کے تمام لوگ اکٹھے ہو گئے اور ہمیں دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گئے۔

اور ہمارے اندر گویا ایک بندھ ٹوٹ گیا۔ صدیوں کا ملبہ صاف ہو گیا اور احساسِ مسرت سے ہمارے دل میں فوارے چھوٹ پڑے۔

قصّہ نصف صدی کا

موت ، حادثہ ، ریٹائرمنٹ ، دل کا دورہ ، مہلک بیماری، ٹریجڈی،
پچاس سال کا ہونا ، یہ واقعات دوسروں کے لئے ہیں۔

پیدائش ۔ شادی۔ ترقی ۔ سدا بہار جوانی ۔ اچھی صحت ، یہ سب اپنے لیے مختص ہیں۔ لوگ ہمیں مبارکباد دیتے ہیں۔ ہم ان کے تئیں اُن کی بدقسمتی کے لیے افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔

لیکن اکثر نظام قدرت میں بھی خامیاں رہ جاتی ہیں۔ حادثات ہو جاتے ہیں۔ جو واقعات اور حادثات دوسروں کے لئے ہوتے ہیں ، وہ کبھی کبھار اپنے ساتھ بھی پیش آتے ہیں۔

پچھلے مہینے ، ایک دن جب غالباً اللہ میاں آرام کر رہے تھے اور ان کے اہم فرشتے شطرنج کھیلنے میں مشغول تھے ، کسی جونیئر اہلکار نے جس کی مدت ملازمت میں کمی کر دی گئی تھی جان بوجھ کر نظام قدرت میں رخنہ ڈال دیا۔ سب کچھ اُتھل پتھل ہو گیا۔ اس دن حیدرآباد میں ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا۔

ہم اُس دن پچاس برس کے ہو گئے !

ویسے ہمیں پچھلے چند سالوں سے یہ لگتا تھا کہ یہ سانحہ جو صرف دوسروں کے لیے مخصوص ہے ایک نہ ایک دن ہمارے ساتھ بھی درپیش ہوگا بلکہ ہم نے تو اپنے قریبی دوستوں کو بہت عرصہ پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہم اس ٹریجڈی کا شکار ہونے والے ہیں۔ یہ وصف (TALENT) ہم میں بچپن سے ہی پایا جاتا تھا۔ ہمیں ہمیشہ معلوم ہو جاتا تھا کہ مستقبل قریب میں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ مثلاً بچپن میں ہم جب دودھ کی بوتل ہاتھ میں تھامتے تھے تو ہمیں پتہ لگ جاتا تھا کہ چند ہی لمحوں میں یہ دودھ ہمارے پیٹ میں ہوگا۔ ہماری چھوٹی عمر میں ہی ایک دن ہمیں دودھ پیتے ہوئے دیکھ کر کسی پہنچے ہوئے بزرگ نے پیشینگوئی کی تھی کہ یہ بچہ بڑا ہونہار ہے اُسے غیب کی باتوں کا علم ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ بڑی عمر پائے گا۔ کم ازکم پچاس برس تک تو ضرور پہنچے گا! اس بزرگ کی بات صحیح تھی۔ یہ جوہر قدرتی دین کے روپ میں ہم میں ہے۔ چنانچہ صبح جب ہم ناشتہ کر کے کار میں بیٹھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ چند ہی منٹ میں ہم آفس پہنچ جائیں گے۔ ہمیں یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آفس میں تیسرا فون ہمارے گھر سے آئے گا۔ شروع شروع میں اس فون پر سوال ہوتا — "گھر کب آؤ گے؟" اب یہ ہوتا ہے "پہنچ گئے؟" اسی طرح شام کو جب ہم آفس بند کر کے نکلتے ہیں تو یقین ہوتا ہے کہ اب ہم گھر پہنچنے والے ہیں۔

ویسے ہماری نصف صدی کی آمد کا ڈھنڈورا تو طالب خوندمیری نے تین سال پہلے زندہ دلان کے مشاعرے میں پیٹ دیا تھا۔ بھری سبھا میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہم عمر کے اس پیٹھے میں ہیں جہاں سے بزرگی کی دہلیز شروع ہوتی ہے اُس دن سے کافی لوگ ہم سے کترانے لگے۔ سچ ہے بزرگی تنہائی کا آغاز ہوتی ہے۔

اپنی عمر کو راز میں رکھنا صرف عورتوں کو ہی عزیز نہیں ہوتا۔ ہم سب کو اس کا حق ہے
طالب نے نہ صرف وہ راز قبل از وقت فاش کر دیا بلکہ ایسا کرتے وقت مبالغہ
آمیزی سے بھی کام لیا۔ خیر دوستوں کا کیا فائدہ اگر وہ آڑے وقت لانے میں کام نہ آئیں۔
ہم نے سُن رکھا تھا کہ پچاس سال کا شخص بوڑھا ہوتا ہے۔ اس کے
اعضاء تھک جاتے ہیں۔ اعصاب میں کمزوری آجاتی ہے۔ اُس میں جسمانی پُھرتی
اور دماغی لچک نہیں رہتی۔ وہ سست اور آرام طلب ہو جاتا ہے۔ اُس کے عقیدے
فرسودہ ہو جاتے ہیں ــــ وہ ہر بات یا رائے کو ناقابل عمل قرار دے کر اسے
رد کر دیتا ہے اور ہمیشہ اپنی رائے دوسروں پر ٹھونستا ہے۔ ہر بات میں اپنے تجربہ
کا حوالہ دیتا ہے۔ ہر بات کو سوچ سمجھ کر کرنے کی تلقین کرتا ہے اتنا کہ وہ سوچتا
زیادہ ہے سمجھتا کم اور کرتا کچھ نہیں۔ اس کی نظریں ماضی کی طرف جمی ہوتی ہیں
وہ مستقبل کی طرف نہیں دیکھتا۔ ایسے شخص سے دور رہنا چاہیئے۔ خاص طور پر
عورتوں کو۔

لیکن یہ تمام صفات تو آج کل کے نوجوانوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ
کہیں گے دیکھا پکڑے گئے۔ ایسا تبصرہ کرنا ہی نصف صدی تجاوز کرنے کی
علامت ہے۔ لیکن یہ ریمارک ہمارا نہیں۔ یہ تو ہم نے عرصہ ہوا کسی بوڑھے شخص سے
سے سُنا تھا۔ ہم تو صرف اس کو دُہرا بلکہ تہرا یا چہرا رہے ہیں۔ اُس کا کہنا
تھا کہ آج کل کے نوجوان بڑے خوش نصیب ہیں۔ وہ جوانی میں بڑھاپے کا مزا
لیتے ہیں۔ جہاں تک ہمیں یاد ہے۔ یہ ریمارک غالباً ہم پر ہی پاس کیا گیا تھا۔
جب ہم پچیس برس کے تھے اور تبصرہ نگار پچاس برس کا۔ ہمیں یاد ہے کہ اس
نے ایک لمبی اور ضعیف کھانسی کھانسنے کے بعد بہ مشکل تمام یہ الفاظ اپنے

مُنہ سے نکالے تھے۔ جواباً ہمارے مُنہ سے صرف یہ دُعا نکلی تھی۔ خدا کسی کو پچاس برس کی عمر تک نہ پہنچائے۔ کون کہتا ہے کہ دُعا کا اثر اُلٹا نہیں ہوتا؟

اُس دن یعنی جس دن ہمارے ساتھ نصف صدی والا واقعہ ہوا۔ یقین مانئے ہمیں نہ خود اپنے آپ میں اور نہ ہی اپنے ماحول میں کسی تبدیلی کا احساس ہوا۔ روز مرہ کا معمول سب ویسا ہی تھا۔ ہمارے اُٹھنے سے پہلے سورج نکل چکا تھا۔ پچھلے کئی دہوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ ہم نے کئی بار سورج پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیشہ ہم سے بازی لے جاتا ہے۔ وہ پیدا بھی ہم سے پہلے ہوا تھا۔ اور اس دن سے ہی روز اُٹھنا بھی ہم سے پہلے ہی ہے خیر۔ ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں۔ وہ ہم سے سینیئر ہے اور سینیئر کو یہ حق رہتا ہے کہ وہ پہلے اُٹھے پہلے سو جائے اور پہلے مر جائے۔ اسے ساری دنیا کو روشنی دینا ہوتا ہے۔ گرمی پیدا کرنا ہوتا ہے لُو چلانا ہوتا ہے۔ سُوکھا لانا ہوتا ہے۔ ہمارے کپڑوں کو سُکھانا اور پھولوں کو مرجھانا ہوتا ہے۔ گویا کئی قسم کے نیک اور بد کام کرنے ہوتے ہیں اور پھر اندھیرا ہونے سے پہلے ہی اُسے چُھپ جانا ہوتا ہے۔ اُس کے مقابلہ میں ہمیں کیا کام ہے؟ ہم خستہ جاں کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔ اسی لیے ہم ہائے ہائے کرنے کے بجائے اُسے اپنے سے پہلے ہی طلوع ہونے کا موقع دیتے ہیں۔

ماما بھی اُٹھ چکی تھی۔ یہ ماما ہندوستانی ماما ہے۔ انگریزی نہیں جیسے کئی ان پڑھ لوگ ممی بھی کہتے ہیں۔ یہ کھانا پکانے والی ماما ہے۔ ساتھ سونے والی نہیں (عام طور پر) ـــــ وہ انگریزی والی ممی تو ابھی سو رہی تھی۔ ماما چائے بنا کے لاتی ہے تو ممّی اُٹھتی ہے۔ ممّی کا ماما کے ساتھ وہی رویہ ہے جو ہمارا

سورج کے ساتھ ہے ۔ اس کے کام میں مُخل مت ہو۔

بچّے سو رہے تھے ۔ جب تک ہم آفس نہ چلے جائیں ہمارے بچّے سوتے ہی رہتے ہیں ۔ ادھر ہمارا آفس کھلتا ہے ۔ ادھر ان کی آنکھ کھُلتی ہے ۔ آجکل کمپیوٹر سے کتنے دور دراز کے اور انہونے کنکشن ہو جاتے ہیں۔

خیر ہم اُٹھے ۔ اِدھر ہم اُٹھے، اُدھر ہمارا کتّا اُٹھا ۔ کتّا ہمارے پہلو میں ـــــ یعنی پاس ہی سوتا ہے ۔ ہم پلنگ پر اور وہ غالیچے پر ۔ ہم اُٹھتے ہیں تو وہ بھی انگڑائی لیتا ہے ۔ سارے گھر میں صرف کتّا اور ہم ایک ساتھ اُٹھتے ہیں ۔ ہمارا کتّا دراصل کُتیا ہے ۔ کتّا نہیں لیکن یہ بات ہم نے آپ کو پہلے اس لئے نہیں بتائی کہ آپ کو کہیں غلط فہمی نہ ہو جائے ۔ ویسے بھی مہذب لوگ کتیا کو یا تو مؤنث کتّا یا خاتون کتا کہتے ہیں ۔ اس روایت کے مطابق ہمیں کہنا چاہیئے تھا کہ خاتون کتا ہمارے پاس ہی سوتی ہے اور ہمارے ساتھ اُٹھتا ہے اس سے گرامر میں ضرور کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے لیکن غالباً آپ اس بات میں ہم سے متفق ہوں گے کہ تہذیب گرامر سے زیادہ ضروری ہے۔

قصّہ کوتاہ اُس دن سب کچھ نارمل تھا ۔ بقول فیض ع

"ہر چیز وہی ہے جو کہ تھی" یعنی آسمان حدِ نگاہ ۔ رہ گزر رہ گزر ۔ شیشۂ مَے شیشۂ مَے ہم نے اپنے بازوؤں کے پٹھوں کو ٹٹولا ۔ ان میں وہی کمزوری تھی جو جوانی کے دنوں میں محسوس ہوتی تھی، اطمینان ہوا ۔ کمرے کا جائزہ لیا ۔ نظر میں وہی دھندلا پن جو پچھلے تیس برسوں سے چلا آ رہا تھا ۔ مزید اطمینان ہوا ۔ یادداشت کو آزمایا ۔ کل جو کچھ ہوا تھا سب یاد تھا ۔ بازو والے بستر پر نگاہ ڈالی ۔ وہی عورت جو پچھلے ستائیس برس سے اس پر سوتی چلی آ رہی تھی،

محوِ خواب تھی۔ سب کچھ وہی تھا۔ کچھ بھی تو تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

پھر فون کی گھنٹی بجی۔ ہم آپ کو یہ بتانا بھول گئے تھے کہ خاتون کُتّے کی طرح رات کو فون ــــ ہمارے بستر کے پاس ہی رہتا ہے۔ اگر کوئی ایسا ویسا فون آجائے تو ہم خود جواب دینے کی بجائے خاتون کُتّے کا مُنہ فون کے ساتھ لگا دیتے ہیں اور وہ بھونکنا شروع کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اب رات کو فون آنے کم ہو گئے ہیں۔ دن کے وقت فون کا جواب دینے کے لیے ہمیں کُتّے کی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خیر اب تو صبح تھی۔ صبح کے وقت ہم خود فون اٹھاتے ہیں۔ آلہ سے آواز آئی

"کیا آپ کا فون ٹھیک کام کر رہا ہے؟"

ہم نے جواب دیا "صاحب پچاسویں سالگرہ ہماری ہے۔ ہمارے فون کی نہیں۔"

جواب ملا۔ "نہیں صاحب آج حیدرآباد ٹیلی فونس محکمہ کی پچاسویں سالگرہ ہے اس لیے ہم سپیشل سروس دے رہے ہیں۔"

ہم نے کہا "یہ فون آج بھی اتنا ہی ناکارہ ہے جتنا پچیس سال پہلے تھا۔"

اُس نے کہا "تھینک یُو سر۔ اس کا مطلب نارمل ہے۔"

دوسری بار قصہ کوتاہ (پہلے قصہ کوتاہ کے لیے دیکھئے پچھلا صفحہ) پچاس سال کی تکمیل پر کچھ نہیں بدلتا۔ یہ سب سُنی سنائی باتیں ہیں اور آپ کو بارہا تجربہ ہوا ہوگا کہ سنی سنائی بات پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ باتیں یا تو پچاس برس سے زائد عمر کے لوگوں نے حسد کی وجہ سے پھیلائی ہیں یا ان لوگوں نے اُس کی تشہیر کی ہے جن کو پچاس برس کے لوگوں کے تجربہ۔ دانشمندی اور

حکمتِ عملی سے ڈر ہے کہ ان کے سامنے ان کی کچھ چلنے والی نہیں۔ یہ مہم خاص طور پر اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب حفیظ جالندھری نے اپنی پچاسویں سالگرہ پر کھلے عام اعلان کیا تھا کہ "ابھی تو میں جوان ہوں"۔

اور یہ ہے بھی صحیح۔ پچیس اور پچاس برس کے شخص میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ یہ کہ موخر الذکر ہر لحاظ سے بہتر ہوتا ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس کا احساس صرف انہیں لوگوں کو ہے جو اس منزل پہ پہنچ چکے ہیں۔ فضا میں ایک ہلکی سی، نازک سی تبدیلی آجاتی ہے۔ جہاں پہلے ہمیں جواں سال و جواں فکر کے لقب سے نوازا جاتا تھا۔ اب کہنہ مشق کہا جاتا ہے۔ جہاں پہلے ایک حرکیاتی افسر کہا جاتا تھا، اب تجربہ کار اہلکار مانا جاتا ہے۔ جہاں پہلے حسین و جمیل جیسے لفظ استعمال کئے جاتے۔ وہاں اب پختہ سنجیدہ اور جہاں دیدہ جیسے الفاظ کانوں سے ٹکراتے ہیں۔ پہلے ہم تمام دفتروں میں سب سے کم عمر افسر تھے اور اب سارے آفیسر حتیٰ کہ وزیر بھی ہم سے کم عمر ہوتے ہیں۔ جہاں پہلے خواتین ہم سے بات چیت کر کے خوش ہوتی تھیں اب بڑے ادب سے سلام کر کے کھسک جاتی ہیں۔ جہاں پہلے ڈاکٹر ہر بیماری کے خدشے کو ہاتھ کے اشارے سے ہنس کر بھگا دیتا تھا، اب ذرا احتیاط برتنے کی صلاح دیتا ہے۔

یقیناً فضا بدلی ہے۔ وہ بدلے ہیں اور نتیجتاً ہم بدلے ہیں۔ ہم لاکھ پروٹسٹ کریں لیکن سرحد تو پار ہو گئی۔ بڑھاپا صرف عمر کی بات نہیں۔ بچوں کا جوان ہونا بڑھاپا ہے۔ ریٹائرمنٹ کی عمر قریب ہونا بڑھاپا ہے۔ اپنے ہمدمانِ دیرینہ کا رفتہ رفتہ چھن جانا بڑھاپا ہے۔ لیکن پچاس برس کے شخص کو بوڑھا نہیں کہا جا سکتا۔ پچاس برس کے شخص کو امریکہ اور یورپ میں ادھیڑ عمر کا شخص

جانا جاتا ہے یعنی وہ مرحلہ جس پر عمر، پرانے موزے یا سوئیٹر کی طرح اُدھڑنی شروع
ہو جاتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ جب یہ عمل زور پکڑ لیتا ہے تو بڑھاپا شروع ہو جاتا ہے
اسی لیے تو ششٹی پورتی مناتے ہیں۔ اس بات پر زور دینے کے لیے کہ ہم ابھی
بوڑھے نہیں ہوئے اور ابھی ساغر و مینا ہمارے آگے سے نہ ہٹائیے۔ اگر آپ نے
اس بات پر اصرار کیا کہ پچاس برس کا شخص بوڑھا ہوتا ہے تو پھر ہم امریکہ یا
کسی اور ترقی یافتہ ملک چلے جائیں گے جہاں ہمارا شمار ابھی کھوسٹوں میں
نہیں ہو گا۔

پھر بھی اب ہم سوچتے ہیں کہ جو باتیں ہم نے اپنی دانست میں دوسروں
کے لیے ریزرو کر رکھی تھیں ان ہی سے ایک ہمارے ساتھ بھی ہو گئی۔ اب
یقیناً باقی ریزرو باتوں کا سامنا ہو گا۔ رفتہ رفتہ ہم "دیگر شخص" بلکہ غیر
بنتے چلے جائیں گے۔ پچاس برس کی عمر کے ساتھ ہی اس رینگتی ہوئی بیگانگی
کی آمد کا احساس شروع ہو جاتا ہے یہی چیز ہے جو پچاسویں سالگرہ کو اس
سے پہلے کی تمام سالگرہوں سے مختلف بناتی ہے۔ صاحبان! آج میں آپ
سے اور خود اپنے آپ سے مختلف ہوں۔ مجھے مبارکباد نہ دیجیے۔ میرے ساتھ
ہمدردی جتلائیے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ کیسے ہیں وہ لوگ جو ششٹی پورتی مناتے
ہیں اور بعد میں سو سال تک جیتے ہیں ہم تو اس پچاسویں سال کی آمد سے ہی گھبرا
گئے ہیں۔

■■

ہم نے کیا کیا نہ کیا...
بیوی سے جھگڑا نہ کرنے کے لیے

ہم نے ریڈیو والوں سے یہ پوچھا کہ اس عنوان پر کچھ کہنے کے لیے ہمیں ہی کیوں چُنا گیا ــــ کیا ہمارے گھر کی نشریات اُن تک پہنچ چکی ہیں ؟ ــــ اُنھوں نے جواب دیا کہ آپ بے فکر ہو کے کچھ بھی کہہ دیجیے مذاق مذاق میں کسی بات کا کوئی بُرا نہیں مانتا۔ یہ آپ ہمیں بتا رہے ہیں؟ زندگی بھر ہماری مذاق مذاق میں کہی باتوں کا ہی بُرا مانا گیا کیونکہ ہم میں سنجیدگی سے بات کہنے کی نہ تو اہلیت ہے اور نہ ہی ہمّت ــــ جب ہم نے بیگم کو بتایا کہ ریڈیو والے ہمیں اس موضوع پر کچھ لکھنے کے لیے کہہ رہے ہیں تو انھوں نے فوراً منع کر دیا۔ دراصل اُنھوں نے ہمیشہ ہماری ہر تجویز پر 'نہ' ہی کہی ہے سوائے ایک بار کے۔ وہ جب پہلے پہل ہم نے شادی کی تجویز رکھی تھی تو اُنھوں نے ہاں کہی تھی۔ اُس کے بعد

کارلائل کا "دائمی انکار" ہی ملا۔

بیگم نے پوچھا — "یہ ریڈیو والوں کو کیا دلچسپی ہے، کسی کی نجی زندگی کی تفصیلات سے؟" پھر ذرا سوچ کر بولیں "پہلے یہ بتائیے کہ اُن کو یہ معلوم کیسے ہوا کہ ہم میں جھگڑا ہوتا ہے؟ آپ ہی نے یقیناً گھر کا بھید کھولا ہوگا۔ میں نے آپ سے لاکھ بار کہا ہے کہ گھر میں سو باتیں ہوتی ہیں ہر بات باہر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

یہ لاکھ بار والی بات مبالغہ آمیزی ہے۔ پچیس[25] سال میں اگر لاکھ بار کہا جائے تو دن میں ہزار بار سے بھی زیادہ ہوا۔ ہماری بیگم کے لیے بھی یہ کچھ زیادہ تعداد ہے۔ ہمارا خیال ہے اسے آسانی سے دس سے تقسیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ بیوی کے لیے لاکھ بار کہنے کے لیے اور لاکھوں باتیں ہوتی ہیں، اور ایک دن میں اتنا وقت کہاں؟

"آپ نے ان سے یہ کیوں نہ کہا کہ ہمارا آپس میں جھگڑا ہوتا ہی نہیں؟ اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو یہی جواب دیتی۔"

دراصل میں نے بھی پہلے یہی جواب دیا تھا کہ یہ عنوان ہم پر لاگو نہیں ہوتا۔ ہم کبھی جھگڑا نہیں کرتے بلکہ میں تو ہر آتے جاتے شخص سے بھی یہی کہتا رہتا ہوں کہ ہم کبھی جھگڑا نہیں کرتے۔ لیکن ریڈیو والے سب ہی شادی شدہ ہیں۔ انھوں نے میرے اس جواب پر صرف اتنا ہی پوچھا — "تو کیا آپ کی شادی نہیں ہوئی؟"

ہم نے احتجاجاً کہا — "دیکھئے بار بار آپ یہ سوال کیوں دہراتے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا — "دیکھئے اِس میں کوئی ذاتی بات نہیں، آپ کو

صرف علامت کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ تمام خاوندوں کی نیابت کریں۔

ہم نے سوچا — اس پچیس سالہ ازدواجی زندگی پر طائرانہ نظر ڈالی جائے — وہ وقت یاد آیا جب بیگم کو ابھی کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ پہلی بار اپنے ہاتھ سے کھانا بنایا — ہم نے کھایا تو پیچش کا زبردست حملہ ہوا، ٹھیک ہوئے تو پھر ایسا ہی کھانا بنایا — وہ کھانا کتّا کھا گیا۔ بیگم روتی ہوئی آئیں اور شکایت کی کہ آپ کے لیے بنایا ہوا خاص کھانا کتّا کھا گیا —

ہم نے تسلّی دی۔ کوئی بات نہیں۔ ہم آپ کے لیے ایک اور کتّا لے آئیں گے۔ اور واقعی لے آئے اور وہ بھی ایک بار نہیں کئی بار —

پھر ایک بار ہم نے کسی ہوٹل میں بہت ہی لذیذ کھانا کھایا —
بیگم نے کہا "اگر میں آپ کے لیے ایسا ہی کھانا بناؤں تو مجھے آپ سے کیا ملے گا؟
ہم نے کہا "ہماری لائف انشورنس کی پالیسی"
جھگڑا نہیں ہوا۔

پھر ایک بار شروع شروع میں رات سونے سے پہلے بیگم نے پوچھا "سب کچھ بند کر دیا آپ نے؟"
"ہاں — جو کچھ بھی بند ہو سکتا تھا —"
"مطلب؟"
"سوائے تمہاری زبان کے سب کچھ بند کر دیا"
جھگڑا ہوا —

پھر ہم ڈاکٹر کے پاس گئے بلکہ لے جائے گئے۔ بیگم نے ہماری بیماری کی تمام تفصیلات ڈاکٹر کو بتلائیں۔ ڈاکٹر نے ہمارے لیے آرام تجویز کیا اور ساتھ ہی جلدی نیند آنے کی دوائی دی۔ جو بیگم کے لیے تھی۔ اس پر جھگڑا ہوا — ڈاکٹر کے ساتھ۔

پھر ایک دن ہم اونچی آواز میں مارک ٹوین کو (MARK TWAIN) پڑھ رہے تھے۔ مارک ٹوین کو اونچی آواز میں ہی پڑھنے کا مزا آتا ہے دبی زبان میں پڑھا جائے تو دوسروں کو تعجب ہوتا ہے کہ یہ شخص خواہ مخواہ کیوں مسکرا رہا ہے۔ بیگم عین اس وقت کمرے میں داخل ہوئیں جب ہم اس فقرہ پر پہنچے تھے۔

"زیادہ قربت سے نفرت — اور بچے پیدا ہوتے ہیں۔"

"کوئی اچھی رائے نہیں قائم کی آپ نے کبھی۔"

"یہ میری رائے نہیں، مارک ٹوین کی رائے ہے۔"

"جی ہاں — میں خوب جانتی ہوں، میں آپ کی زندگی کو ایک کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتی ہوں۔"

"ضرور پڑھئے، لیکن اونچی آواز میں نہیں۔"

جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ کم بخت مارک ٹوین۔ ہم نے اسی لیے مولانا حالی کو اونچی آواز میں کبھی نہیں پڑھا۔ ایسے بزرگوں کے لیے آج کل کی نسوانی آزادی پسند عورتوں کے پاس ایک تین نفظی لقب ہے — خواہ مخواہ کیوں مولانا کی روح کو تکلیف دی جائے۔

ایسے اور کئی واقعات کے بارے میں ہم سوچ رہے تھے، یہ اُن جھگڑوں

گے بارے میں ہے جو ہوتے ہوتے رہ گئے جو رہتے رہتے ہو گئے۔

اب بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے کہ ہم ایسی ہی باتوں کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں اور ہم سوچ میں غرق۔ بیگم پوچھتی ہیں "دماغ کہاں ہے۔ کیا سوچ رہے ہو ــــ؟"

"کچھ نہیں" ہمیشہ ایک ہی جواب۔

"اتنا مت سوچا کرو۔ خاص کر کھانے کی میز پر"

جی ہاں۔ ہمارے والدین کے گھر کھانے کی میز پر بولنا منع تھا۔ اب ہمارے گھر سوچنے پر بھی پابندی لگ گئی ہے۔ کون کہتا ہے ہم نے ترقی نہیں کی؟

ہم نے خیال کی چڑیا کو غلیل ماری۔ بیچاری تڑپ کر نیچے گر پڑی۔ ہم بھی دھڑام سے زمین پر آن پڑے۔ ہم نے ہڑبڑا کر کہا "وہی سوچ رہا تھا۔ وہ ریڈیو والوں کو کیا جواب دوں"

بیگم نے تسلّی دلائی "اگر آپ کو کچھ کہنا ضروری ہے تو کہہ دیجئے کہ آپ نے جھگڑا نہ کرنے کے لیے کبھی کچھ نہیں کیا، سب کچھ ہمیشہ میں ہی کرتی ہوں"

سُنا آپ نے۔ ریڈیو والو، سامعین کرام۔ نوٹ کر لیجئے۔ ہمیشہ اور سب کچھ بیگم ہی کرتی ہیں ــــ!! ■■

(آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہوئی)

کوڈان

"کوڈان" انگریزی لفظ "کوڈ" کی دکنی سٹائل میں جمع ہے۔ جمع کی ضرورت اس لیے پڑی کہ اس وقت بے شمار کوڈ رائج ہیں۔ ویسے تو ہر زبان بجائے خود ایک کوڈ ہے۔ پھر ہر زبان کے اپنے کوڈ ہوتے ہیں جو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو کوڈ کے گُر جانتے ہوں۔ شارٹ ہینڈ بھی کوڈ ہے جس کے ذریعہ سے لمبی چوڑی اور سیدھی سادی تحریر چند منحنی لکیروں میں سماجاتی ہے۔

خفیہ پولیس والوں کا اپنا کوڈ ہوتا ہے۔ مثلاً انہیں اگر یہ پیغام بھیجنا ہو کہ فلاں شہر میں فساد ہونے کا خطرہ ہے تو وہ کوڈ میں تار بھیج دیں گے کہ جیا بہادری کے لڑکی پیدا ہونے والی ہے۔ خبردار ہو جاؤ۔

محکمہ ڈاک و تار نے عوام کی سہولت کے لیے تاروں کے کوڈ بنائے ہیں مثلاً: اگر آپ کو عید مبارک کا تار بھیجنا مقصود ہو تو آپ صرف اتنا کہہ دیں کہ تار نمبر دو بھیج دیں۔ شادی کی مبارکباد کے تار کا نمبر سترہ ہے۔ اس طرح مختلف موقعوں کے لئے ان کے پاس متعدد کوڈ ہیں۔

ریڈیو اور فلموں والے بھی کوڈ کا استعمال کرتے ہیں مثلاً فلم والے ریل کے ایکسیڈنٹ، طوفان اور طغیانی، جہاز کی اڑان اور جلسے جلوسوں کے سین فلما کر تیار رکھتے ہیں۔ پروڈیوسر اپنے اسسٹنٹ کو بھیجتا ہے۔ بھئی ذرا دیکھنا وہ تین نمبر کا سین تین سکنڈ کے لیے اور پندرہ نمبر کا سین ایک منٹ کے لیے لے آؤ۔ اس کا مطلب یہ کہ اسے ایک اندھیری رات میں طوفان کا سین چاہیئے جس میں ہیرو پہاڑ کی چوٹی سے سمندر میں چھلانگ مارتا ہے۔ اب وہ سین ہر ہیرو چاہے وہ راجیش کھنہ ہو یا ناگیشور راؤ "پرفٹ" ہو جائے گا کیونکہ اصلی چھلانگ مارنے والا تو وہ بیچارہ سٹنٹ مین ہے جس کو اس سین کے لیے مبلغ پچاس روپے نقد دیئے گئے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ کوڈ سسٹم کو ابھی اور بھی بڑے پیمانے پہ ہماری روزمرہ زندگی میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سے زندگی آسان ہو سکتی ہے اور روزمرہ کے کئی فضول قسم کے خطبے اور تکلفات ترک کئے جا سکتے ہیں۔

مثلاً ہم جب بھی کسی دوست سے ملتے ہیں ہمیشہ یہی سوال پوچھتے ہیں

"کہو بھئی کیا حال ہے؟"

اس کا جواب ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ پھر وہ آپ سے وہی سوال پوچھتا ہے اور آپ بھی وہی جواب دیتے ہیں۔

پھر چونکہ اور کوئی بات کہنے کو نہیں ہوتی اس لیے تھوڑی دیر کے بعد آپ ذرا اوب کر پوچھتے ہیں۔

"اچھا اور کیا حال ہے؟"

اس کا جواب ہوتا ہے "اچھا اور بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔"

اس قسم کے سوال جواب کچھ اتنے بندھے ٹکے ہو گئے ہیں کہ اگر کوئی شخص سخت بیمار ہو اور آپ اس سے اس کا حال پوچھیں تو بھی وہ یہی جواب دے گا کہ وہ ٹھیک ہے۔ ہمیں آج تک صرف ایک ہی شخص ایسا ملا جس کا جواب ذرا مختلف تھا۔ وہ بے چارہ کینسر کا مریض تھا اور اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ ایک دن ہم اس سے ملنے گئے اور رسماً پوچھا:

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

اس نے جواب دیا "بہتر ہے" اور پھر کچھ رک کر وضاحت کی:

"میرا مطلب ہے پہلے سے تو بدتر ہے لیکن آنے والے کل سے بہتر ہے"

آپ گھبرایئے مت اور خواہ مخواہ احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہو جایئے، یہ رسمی گفتگو صرف ہندوستان میں ہی نہیں۔ دوسرے ملکوں میں بھی ہوتی ہے۔ ہم نے بیشتر ممالک میں دیکھا ہے کہ دستوری گفتگو ایسے ہی ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل ہمیں چند عرب ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ہمیشہ ہر ملاقات پر گفتگو مندرجہ ذیل جملوں سے شروع ہوتی ہے۔

زید: "صبح خیر"

بکر: "صبح خیر"

زید: "کیا حال ہے؟"

بکر: "ٹھیک ہے۔ شکر ہے خدا کا۔ تمہارا کیا حال ہے؟"

زید: "ٹھیک ہے۔ شکر ہے خدا کا"

اس سے زیادہ عربی ہم سیکھ نہ پائے۔ شکر ہے خدا کا۔

انگریز اور امریکن لوگ تو اور بھی کمال کرتے ہیں۔ سوال کا جواب، سوال سے دیتے ہیں مثلاً: جب وہ کسی سے پہلی بار ملتے ہیں تو گفتگو یوں شروع ہوتی ہے

ٹام : "آپ کا کیا حال ہے؟"

جم : "آپ کا کیا حال ہے؟"

شروع شروع میں ہم سمجھتے تھے کہ جم اصرار کرتا ہے کہ پہلے تم اپنا حال بتاؤ تو پھر میں بتاؤں گا۔ میں پہلے کیوں بتاؤں؟ اور ہمیں یہ ڈر رہتا تھا ابھی ان کی لڑائی ہوگی۔ بالکھنؤ کے نوابوں کی طرح پہلے آپ پہلے آپ میں گاڑی چھوٹ جائے گی۔ لیکن صدیاں بیت گئی ہیں۔ آج تک نہ ٹام نے اور نہ جم نے اپنا حال بتایا ہے اور ان کی نسلیں ابھی تک ایک دوسرے کو کرید رہی ہیں۔

اب اگر ہم "آپ کا کیا حال ہے؟" کو کوڈ نمبر ایک اور "میرا حال ٹھیک ہے شکریہ" کو کوڈ نمبر دو دے دیں تو ملاقات کے وقت گفتگو کچھ ایسے ہوگی

زید : "ایک"

بکر : "دو۔ ایک"

زید : "دو"

آپ خود ہی سوچئے اس طرح کتنا وقت بچے گا۔ ہم نے سنا ہے کہ امریکہ میں روزمرہ کے تکلفات کو کوڈ میں بدلنے کا تجربہ شروع ہوگیا ہے۔ وہاں کی ایک جیل میں جہاں "عمر قیدی" رہتے ہیں یہ تجربہ کیا گیا ہے۔ وہ قیدی روز شام ملتے اور وہی پرانے لطیفے سناتے وہی پرانی ہنسی ہنستے ہیں۔ وہاں انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر لطیفے کو ایک کوڈ نمبر دے دیا جائے۔ کسی کو بھی جب لطیفہ سنانا ہو تو وہ صرف لطیفے کا کوڈ نمبر بتا دے۔ اور سننے والے اس کو سن کر اور اس کی

دلچسپی کو مدنظر رکھ کر مناسب مقدار میں ہنس دیں ــــــ ایک دن وہاں ایک نیا قیدی آیا۔ شام کو جب معمول کے مطابق محفل جمی تو ہر قیدی نے اپنی پسند کا لطیفہ سُنایا۔

"لطیفہ نمبر پانچ"

"ہاہا۔ ہاہا"

"لطیفہ نمبر سترہ"

"ہی ہی ہی ہی"

"لطیفہ نمبر سات"

اس لطیفے کو سن کر کچھ قیدی تھوڑا سا ہنسے۔ لیکن ایک قیدی بہت ہنسا اور جب سب نے ہنسنا بند کر دیا تو بھی وہ ہنستا رہا۔ نئے قیدی نے جیلر سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ باقی سب قیدیوں نے یہ لطیفہ کئی بار سُن لیا تھا۔ اس قیدی نے پہلی بار سُنا ہے اس لیے وہ زیادہ ہنس رہا ہے۔ اس کے بعد نئے قیدی نے بھی ایک لطیفہ سنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اجازت ملنے پر اس نے کہا:

"لطیفہ نمبر تیرہ"

"اس کو سُن کر کوئی بھی نہ ہنسا"

نئے قیدی نے قدرے خفّت سے جیلر سے پوچھا کہ میرے لطیفے پر لوگ کیوں نہیں ہنسے۔ حالانکہ بڑا زور دار لطیفہ تھا۔

جیلر نے اسے سمجھایا کہ لطیفہ تو اچھا تھا لیکن لطیفے کی کامیابی اس کے

سنانے کے انداز میں ہوتی ہے۔ تمھارا سنانے کا ڈھنگ ذرا ڈھیلا تھا۔

ہمیں سینکڑوں جلسوں، محفلوں اور مشاعروں وغیرہ میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ کئی حیثیتوں سے ایسی محفلوں میں شرکت کا موقع ملا ہے اس لیے ہم نے ان کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہر جلسہ کے لیے کچھ کیرکٹر لازمی ہیں۔ سب سے پہلے کنوینر جو سارے فساد کی جڑ ہوتا ہے۔ اس کے کئی اور نام بھی ہوتے ہیں۔ جیسے آرگنائیزر یا سکریٹری وغیرہ نام کچھ بھی ہو اس جنس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ منتخبہ یا خود ساختہ۔ قسم چاہے کوئی بھی ہو خصلت ایک ہی ہوتی ہے — اُن میں خود نمائشی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کو اپنی آواز سے عشق ہوتا ہے اور مشہور لوگوں کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کر کے لوگوں کو سنانے کا زبردست اشتیاق۔ انگریزی میں ایسے شخص کو سکینڈل مانگر (SCANDAL MONGER) کہا جا سکتا ہے۔

جلسے کے لیے جس دوسرے کیریکٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو پریسیڈنٹ یا چیرمین یا صاحبِ صدر کہا جاتا ہے۔ اگلے زمانے میں صرف صاحبِ صدر کا ہونا کافی تھا لیکن اب آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے بیروزگاری میں اضافہ ہو گیا ہے اس لیے جلسوں کے لیے ایک اور پوسٹ سینکشن کی گئی ہے۔ اس پوسٹ کو چیف گیسٹ یا مہمان خصوصی کا نام دیا گیا ہے یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ فی جلسہ کم از کم دو وی آئی پیوں کو نپٹایا جا سکے۔ ہمیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ صاحبِ صدر اور مہمانِ خصوصی میں کون سا رتبہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔ یہی اس اختراع کی خوبی بھی ہے۔ خود دونوں صاحبان کو بھی مغالطہ رہتا ہے کہ ایک دوسرے سے زیادہ اہم ہے اور اس طرح ایک تلوار سے دو شکار ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تو

جلسے میں صرف اس لیے آتے ہیں کہ صاحبِ صدر یا مہمان خصوصی کی نظر ان پر پڑ جائے اور شاید انہیں آداب عرض کرنے کا موقع بھی مل جائے۔

چلئے نمونے کے طور پر آپ کو ایک جلسے میں لئے چلتے ہیں ——
محفل موسیقی کی ہے۔ جناب صدر اور مہمان خصوصی کے ناموں کا ڈھنڈورا پٹ چکا ہے۔ اشتہاروں میں لوگوں سے وقت پر آنے کی درخواست کی گئی تھی وقت ہو چکا ہے۔

آرٹسٹ لوگ تیار بیٹھے ہیں۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ منتظمین بے تابی سے صاحبِ صدر کا انتظار کر رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے وہ آتے ہیں ایک گھنٹہ لیٹ۔ لیکن آ تو گئے۔ یہاں آنے سے پہلے وہ کسی مذہبی تقریب میں مہمان خصوصی تھے وہاں دیر ہو گئی۔ مہمان خصوصی اُن کے آنے کے بعد آتے ہیں کیونکہ رواجاً جو شخص زیادہ اہم ہوتا ہے وہ زیادہ دیر سے آتا ہے۔

اب محفل کا آغاز ہوتا ہے۔ کنوینر صاحب، صاحب صدر کی گلپوشی کرتے ہیں۔ حاضرین تالیاں بجاتے ہیں۔ کنوینر صاحب مہمانِ خصوصی کی گلپوشی کرتے ہیں۔ حاضرین پھر تالیاں بجاتے ہیں۔ پھر ایک اور صاحب کنوینر صاحب کی گل پوشی کرتے ہیں۔ اس بار حاضرین کم تالیاں بجاتے ہیں لیکن صاحبِ صدر اور مہمانِ خصوصی خوب زور سے تالیاں بجاتے ہیں۔ پھر مہمانِ خصوصی آرٹسٹوں کی گلپوشی کرتے ہیں۔ اب سب لوگ مل کر تالیاں بجاتے ہیں۔

پھر کنوینر صاحب تھوڑا کھانس کر اپنا گلا صاف کرتے ہیں اور صاحبِ صدر کی تفصیلی سوانح حیات پڑھنا شروع کرتے ہیں۔ وہ پیدا کب اور کیوں ہوئے۔ انھوں نے تعلیم کیوں نہیں پائی اور تربیت کہاں کھوئی۔

ان کی شادی اور اولاد کے بارے میں معلومات کے بعد ان کے سیر اور سیاحت کے شوق کا ذکر ہوتا ہے جو انہیں حیدر آباد سے باہر سکندر آباد اور لالہ گوڑہ تک لے گیا پھر ان کی قوم یا ریاست یا محلہ یا اپنی گلی کے تئیں بے لوث اور اپنے کنبہ کے تئیں لوث خدمات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ تمام معلومات صاحبِ صدر نے خود نہایت مبالغہ آمیزی سے لکھ کر کنوینر صاحب کو پہلے سے ارسال کی ہوئی تھیں لیکن اس وقت ان تفصیلات کو سُن کر وہ بظاہر کچھ ایسے جھینپتے ہیں گویا کوئی نجومی ان کے ماضی کے بارے میں کچھ راز کی باتیں بتا رہا ہو۔

بالآخر کنوینر جلدی سے ایک بار پھر صاحبِ صدر کی تعریفوں کے پُل باندھتے ہیں اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اپنی سونے کی گھڑی سے قیمتی وقت نکال کر یہاں آنے کی تکلیف گوارا کی ہے۔

پھر انہیں الفاظ میں یہی رسم ایک اور چمچہ جیسے مہمانِ خصوصی کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتی ہے۔ ان کے تعلق سے انجام دیتا ہے صاحبِ صدر کی تعریف میں باندھے ہوئے پلوں پر وہ مہمانِ خصوصی کی شان میں سجی ہوئی رکشائیں چلاتا ہے۔ ان رکشاؤں کا رش کئی بار اتنا ہو جاتا ہے کہ حاضرین میں سے کئی منچلے سیٹیاں بجا کر ٹرافک کانسٹبل کا رول ادا کرتے ہیں

اس کے بعد صدر صاحب سے انجمن اور آرٹسٹوں کے بارے میں "چند الفاظ" کہنے کی گزارش کی جاتی ہے۔ "چند الفاظ" کے معنی ہندوستان میں لمبی تقریر کے ہوتے ہیں۔ پہلے تو صدر صاحب کچھ الفاظ سب لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے باقی کے "چند الفاظ" دو حصّوں میں

بانٹے جا سکتے ہیں۔ پہلے حصّے میں وہ سچ بولتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں تو ایک حقیر اور ادنیٰ قسم کا شخص ہوں جو ہرگز اس عزت کا مستحق نہیں تھا جو آپ لوگوں نے مجھے بخشی ہے۔ وہ یہ بھی اعتراف کر لیتے ہیں کہ میرے متعلق جو کچھ بھی آپ کو بتایا گیا ہے وہ مبالغہ آمیزی ہے۔ چونکہ حاضرین کو سچ سننے کی عادت نہیں ہوتی اس لیے وہ اس سچ کو بھی جھوٹ مان کر اسے صدر صاحب کی کسرِ نفسی سمجھتے ہیں۔

اس مغالطے کا فائدہ اٹھا کر اب صدر صاحب اپنے "چند الفاظ" کا دوسرا حصّہ شروع کرتے ہیں جس میں وہ سراسر جھوٹ بولتے ہیں۔ "میں یہاں تقریر کرنے تو نہیں آیا تھا۔ وہ تو مجھے ابھی ابھی پتہ چلا کہ مجھے تقریر بھی کرنا ہے۔ میرا یہاں آنے کا مدّعا تو یہ تھا کہ میں موسیقی اور سنگیت سے لطف اندوز ہو سکوں۔ سنگیت اور آرٹ سے مجھے بچپن سے ہی لگاؤ ہے۔ یہ شوق مجھ میں اسوقت پیدا ہوا جب میں دیواروں پر فلمی پوسٹر چسپاں کر کے اپنا پیٹ پالا کرتا تھا جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں میں یہاں تقریر دینے نہیں بلکہ محفل کا لطف اٹھانے آیا تھا۔ اب میں درخواست کروں گا کہ زیادہ وقت تکلفات پر ضائع کرنے کے بجائے پروگرام کا آغاز کیا جائے۔ اس سے پہلے میں منتظمین کا کلاکاروں کا اور حاضرین کا ایک بار پھر تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ان کا یہ دوبارہ شکریہ ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ جو شکریہ انھوں نے پہلی بار "چند الفاظ" کے شروع میں ادا کیا تھا وہ تہہ دل سے نہیں تھا۔ سطحی اور رسماً تھا۔ تہہ دل تک پہنچنے میں دیر لگتی ہے۔ خاص کر اگر صاحبِ صدر ذرا موٹے اور پھپھس قسم کے شخص ہوں (اور عام طور پر

صدر صاحب فربہ اندام ہی ہوتے ہیں) اس لیے صدر صاحب کے دل کی تہہ تک پہنچنے کے لیے حاضرین کو ایک لمبی تقریر سننا پڑتی ہے۔

لیکن ابھی پروگرام کا آغاز کہاں ؟ آپ مہمان خصوصی کو تو بھول ہی گئے۔ صاحب صدر سے نپٹ لینے کے بعد مہمان خصوصی کی باری آتی ہے اور پھر ان کے تعلق سے پوری کارروائی لفظ بہ لفظ نہیں تو محاورۃً یہ محاورہ دہرائی جاتی ہے۔

اس اثنا میں بے چارہ یا بے چاری آرٹسٹ پہلے تو اونگھنا شروع کرتا یا کرتی ہے اور پھر سٹیج پر ہی سو جاتا یا جاتی ہے۔ اگر آرٹسٹوں میں ایک مرد ہو اور ایک عورت تو پھر ظاہر ہے کہ وہ بھری محفل میں اکٹھے تو سو نہیں سکتے۔ اس لیے باری باری سوتے ہیں۔ جب رسمی کارروائی پوری ہو جاتی ہے تو حاضرین تالیاں بجا بجا کر سوتے ہوئے آرٹسٹوں کو جگاتے ہیں۔ اس کے بعد اصلی محفل کا آغاز ہوتا ہے۔ یعنی آرٹسٹوں کے جاگنے کا اور صدر اور مہمان خصوصی کے سونے کا وقت شروع ہوتا ہے۔

اگر آپ کو چار پانچ جلسوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ کو اب تک خیر مقدمی تقریر صدر اور مہمان خصوصی کے "چند الفاظ" اور اظہار تشکر کی تقریروں کی سٹینڈرڈ اصطلاحیں اور محاورات زبانی یاد ہو گئے ہوں گے۔ ہمیں تو اس موضوع پر اب اتنی مہارت ہو گئی ہے کہ ہم کسی بھی جلسہ میں بیٹھے ہوئے پھڑکتے اشعار کے مصرعہ ثانی کی طرح صدر اور مہمان خصوصی کی تقریروں کے جملے پورے کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ آداب محفل اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔

ایک بار کسی وی۔ آئی۔ پی کو ایک مشہور اسکول کے سب سے بزرگ استاد کے ریٹائر ہونے پر منعقدہ جلسے میں بلایا گیا۔ جب طالب علموں اور استادوں

کی طرف سے انہیں خراج تحسین پیش کیا جا چکا تو وی۔ آئی پی سے "چند الفاظ" کہنے کی درخواست کی گئی۔ وی۔ آئی۔ پی نے کہا کہ مسٹر حسین کی زندگی ایک مثالی استاد کی زندگی ہے۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی آنے والی نسلوں کی خدمت میں گزار دی ہے۔ انھوں نے پڑھانے کو صرف ذریعہ معاش نہیں بلکہ اپنی زندگی کا واحد مشن سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے طالب علموں سے عقیدت پائی۔ آج جب اسکولوں میں ٹریڈ یونین کا اثر بڑھ رہا ہے پڑھنا پڑھانا بھی گویا ایک انڈسٹری بن گیا ہے ایسے ماحول میں حسین صاحب جیسے استادوں کی موجودگی گویا ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہے۔ ہمارے ملک کی ترقی کے لئے ہمارے اسکولوں کے لیے سینکڑوں اور ہزاروں حسینوں کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہماری ترقی ناممکن ہے۔ اس طرح وہ تقریباً ایک گھنٹہ حسین صاحب کی حقیقی اور خیالی خوبیوں پر بولتے رہے۔ بیچ میں ہیڈ ماسٹر نے کئی بار ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وی آئی پی کی تقریر ایک چشمہ تھی جو بند ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ بالآخر جب تقریر ختم ہونے کو آئی تو ہیڈ ماسٹر نے ہمت کر کے وی۔ آئی۔ پی کو سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا۔

اس پر وی۔ آئی۔ پی صاحب ذرا چونک پڑے۔ ایک لمحے کے لیے وہ رکے اور پھر گویا ہوئے۔ ابھی ابھی مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ جلسہ حسین صاحب کے لیے نہیں بلکہ پرساد صاحب کے لیے منعقد کیا گیا ہے۔ میں نے جو کچھ حسین صاحب کے تعلق سے کہا ہے وہ مناسب ردوبدل کے ساتھ پرساد صاحب پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

ہمارے جلسوں کی رسمی کارروائیوں اور گھسی پٹی اصطلاحوں کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ کسی بھی موقع پر بلا خوف و خطر استعمال کی جاسکتی ہیں۔ گویا ایک جامہ ہے جو ہر کسی کو پہنایا جاسکتا ہے۔ یہ رسمی اور کھوکھلے تکلفات ہماری روزمرہ زندگی کا اتنا اہم جز بن گئے ہیں کہ ہم بیشتر اہم رسموں کے جنگل میں اصلی درخت کو کھودیتے ہیں۔ یہ سب تکلف اور رکھ رکھاؤ تضیع اوقات ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ صاحبِ صدر مہمانِ خصوصی اور منتظمینِ جلسہ حاضرین کے ساتھ ایک قسم کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس لیے ہم نے تقریبًا پانچ سو جلسوں کا بغور مطالعہ کرکے پچھلے سال یہ تجویز پیش کی تھی کہ تمام خیر مقدمی تقاریر، اظہارِ تشکر اور دوسرے تکلفاتی خطبوں اور سٹینڈرڈ محاوروں کو کوڈ نمبر دے دیا جائے اور اپنی تقریروں کے ان رسمی حصّوں کو مقررین کوڈ میں پڑھیں۔ صرف اصلی مواد کو پورے طور پر پڑھیں۔ اردو میں حروفِ ابجد کا کوڈ تو پہلے سے ہی موجود ہے اس کو اب توسیع دیکر الفاظ اور محاورات کا کوڈ بنادیا جائے۔ ہر جلسہ میں اس کوڈ اور اس کی چابی کی کاپیاں تمام حاضرین میں پہلے ہی سے تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ مجوزہ کوڈ میں صاحبِ صدر کے لیے نمبر ایک مہمان خصوصی کے لیے نمبر دو اور حاضرین کے لیے صِفر استعمال کیا جائے گا۔ حاضرین کے لیے صفر کا ہندسہ خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ حاضرین بجائے خود صفر ہوتے ہیں ان کی اپنی کوئی ہستی نہیں ہوتی۔ لیکن وہ جس ہندسے کے ساتھ لگ جائیں اس کی قیمت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس طرح صاحبِ صدر کی قیمت حاضرین کی موجودگی سے ہی بڑھتی ہے۔

اگر یہ کوڈ منظور کرلیا جائے تو نمونے کے طور پر خیر مقدمی تقریر کچھ ایسے ہوگی —— ایک۔ دو۔ صفر دو۔

سات سو دو ۔ چار بٹا پانچ ۔ دو ضرب تین ۔ چار ۔ پچیس سو پچھتر، سترہ ۔ نو ے ۔ بائیس ۔ شکریہ ۔

اس کا حل یہ ہوگا۔

معزز صاحب صدر ۔ مہمان خصوصی اور حاضرین :

آج بہت مبارک دن ہے کہ ہم سب لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں ۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ صاحب صدر یہاں کی کلچرل زندگی کے روحِ رواں ہیں اور اس جلسہ کی صدارت کے لئے ان سے بہتر شخص کا انتخاب مشکل تھا ۔ ان کی خدمات سے بھی آپ بخوبی واقف ہیں ۔ میں ان کا بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود یہاں آنے کے لیے اپنا قیمتی وقت نکالا ہے ... . وغیرہ وغیرہ

مہمان خصوصی کے تعلق سے کہا جائے گا : تین سو چار ۔ سات بٹا نو ۔ چالیس یعنی جو کچھ صاحب صدر کے بارے میں کہا گیا ہے وہ ہمارے مہمان خصوصی پر بھی لاگو ہونا چاہیئے ۔

اس طرح جناب صدر اور مہمان خصوصی بھی ایک آدھ منٹ میں کوڈ کے ذریعہ اپنے تکلفات کا اظہار کر سکتے ہیں ۔ ہم نے بڑے فخر سے یہ تجویز چند اہم اداروں ، لیڈروں اور اخبار نویسوں کے سامنے رکھی ۔ عام طور پر اس تجویز کا خیر مقدم کیا گیا ۔ بعض اداروں کی طرف سے ہمیں تعریفی خطوط بھی آئے ۔ پھر یہ فیصلہ ہوا کہ اس تجویز پر ایک آل انڈیا کانفرنس میں غور کیا جائے ۔ اس کانفرنس میں ہمیں مدعو کیا گیا اور وہاں ہم نے اپنی تجویز کی تفصیلی طور پر وضاحت کی ۔ اس پر بہت بحث ہوئی ، اس کی شدید ترین مخالفت لیڈروں اور جنتا کی طرف

سے ہوئی۔ اور بالآخر تجویز کو بھاری اکثریت سے رد کر دیا گیا۔ اس کی دو اہم وجوہات دی گیئں۔ ایک تو یہ کہ اگر تقریروں سے رسم ورواج کے لوازمات اور تکلفات کو نکال دیا جائے تو پھر مقررین کو اپنی تقریروں میں ٹھوس مواد ڈالنا پڑے گا۔ اس کے لیے انہیں غور و فکر کرنا پڑے گا جس سے ان کے دماغوں پر بوجھ پڑنے کا اندیشہ ہے جو ایک خطرناک امر ہوگا۔ اسی طرح حاضرین کو بھی خواہ مخواہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

ہندوستان میں آج ہر چیز پر ٹیکس لگ چکا ہے۔ صرف انسانی دماغ پر ہی ٹیکس نہیں لگا۔ یہ تجویز دماغ پر ٹیکس لگانے کے مترادف ہے۔ جنتا ہرگز ایسی تجویز قبول نہیں کرے گی۔ جس سے اس کو اپنا دماغ کریدنا پڑے جس کو اس نے صدیوں سے کسی قسم کے کرید اور ٹیکس سے بچا کر محفوظ رکھا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اس تجویز پر عمل کرنے سے لوگوں کا بہت سا وقت بچ جائے گا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوگا۔ اس بچائے ہوئے وقت میں لوگ کیا کریں گے ہمیں یہ تنبیہہ دی گئی کہ ہمارا ملک اس وقت ایک نہایت نازک مرحلے سے گذر رہا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے بے شمار مسائل ہیں۔ ایسے بحرانی دور میں ہمارا یہ فرض ہے کہ ایک سچے ہندستانی ہونے کے ناطے ہم موجودہ مسئلوں کو حل کریں نہ کہ نئے مسئلے پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ کئی لوگوں نے تو یہاں تک کہا کہ یہ تجویز شرانگیز ہے اور ہم امن میں خلل ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہم نے اس اپیل پر غور کیا۔ یہ دلیلیں واقعی ٹھوس ہیں۔ اتنی ٹھوس کہ ایسی بے وقت تجویز رکھنے پر ہم نے انتہائی ندامت کا اظہار کیا اور اسے واپس لے لیا۔

صاحبان! اب آپ بھی اس تجویز کو بھول جائیں ■■

سفرگوئیورپ*

آج کل اردو میں سیاحت نامے لکھنے کا بہت فیشن ہو گیا ہے۔ ایک رسالے میں رام لعل کے یورپ کے سفر کی سرگزشت قسط وار چھپ رہی ہے۔ اُدھر پاکستان سے کرنل محمد خاں کی مہم یورپ "شگوفہ" میں چل رہی ہے۔ یوسف ناظم نے ایک 'سفرنامہ پونا' کا لکھ مارا ہے۔ بھارت چند کھنہ اب دوسری بار امریکہ گئے ہیں۔ اگر انہیں واپس آنے دیا گیا اور ان کی اہلیہ محترمہ مزید کچھ عرصہ کے لئے رُک گئیں تو اُن سے بھی ایک عدد سفرنامے کا خطرہ ہے۔ ویسے سُنا ہے کہ شکاگو شریف کے شہریوں نے ان کے لئے گرین کارڈ کی سفارش کی ہے تاکہ ہندوستان کے لوگ ان کے سفرنامہ سے بچ سکیں۔

ان تمام حضرات میں مشترکہ بات یہ ہے کہ یہ ریٹائرڈ لوگ ہیں۔ کئی دلچسپ تفصیلات انھوں نے یونہی چھوڑ دی ہیں۔ خاص کر کرنل صاحب کے سفرنامے میں جہاں

---

* جیسے TRAVEL اور DILOGUF کو ملا کر انگریزی میں TRAVELOGUE بنایا گیا ہے۔ اسی طرح سفر اور گفتگو کو ملا کر یہ اختراع کی گئی ہے۔

کوئی دلچسپ پہلو نکلنے لگتا ہے وہ گویا " باقی پردہ سکرین پر " کہہ کر سین بدل دیتے ہیں۔ "شگوفہ" کے مدیر کو بہت سے خطوط وصول ہوئے ہیں جن میں سنسر شدہ حصّوں کو بھی چھاپنے کی فرمائش کی گئی ہے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ کوئی ایسا ادیب بھی اپنی سرگزشت یورپ لکھے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ " ابھی تو میں جوان ہوں "!

اس صورت حالات میں ہم اپنے آپ کو بچھڑا ہوا محسوس کرنے لگے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ کوئی چیلنج ہو اور ہم خاموش بیٹھے رہیں۔ ہم نے حکومت سے درخواست کی کہ ہمیں بھی ایک عدد سفر پہ باہر بھیجا جائے تاکہ ہم بھی اردو دان طبقے کی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔ حکومت سے جواب ملا کہ تم کئی بار فارن جا چکے ہو۔ ابھی پچھلے سال ہی ایک چکّر لگایا تھا۔ اسی پر مبنی کچھ لکھ سکتے ہو۔ ہم نے گزارش کی کہ مغربی یورپ میں حالات اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں کہ پچھلے سال کے تاثرات لکھے جائیں تو لوگ سمجھیں گے کہ قرونِ وسطیٰ کی بات ہو رہی ہے۔ اور پچھلے سال تک اُردو میں یہ وبا نہیں پھیلی تھی۔ اس لئے ہمارے ذہن میں یہ آئیڈیا بھی نہیں آیا تھا۔ اس بار ہم، خاص طور پہ اس کام کے لئے جائیں گے ہم نے یہ بھی واضح کیا کہ ہم اندھا دھند تقلید کرنے والوں میں سے نہیں۔ ہم کوئی روایتی سفرنامہ نہیں لکھیں گے۔ اپنی عادت کے مطابق بالکل ماڈرن طریقے کی "TRAVELOGUE" یعنی "سفر گو" لکھیں گے جو اردو ادب میں یقیناً ایک نئی بات ہوگی۔

آج کل حکومت اردو کے بارے میں اتنا ہمدردانہ رویّہ رکھتی ہے کہ ہماری تجویز منظور ہو گئی اور ہمیں فوراً سے پیشتر سفر بند ہونے کا حکم صادر ہو گیا

مندرجہ ذیل سطور اس رپورٹ کی کاپی ہیں جو ہم نے دورے سے واپس آنے پر
حکومت کو پیش کی تھی۔ اس میں کہیں کہیں پچھلے سال کے سفر کے بارے میں بھی ذکر
ملے گا۔ ایسے ناظرین جو ابھی ابھی یورپ سے واپس آئے ہوں انہیں شاید مندرجہ ذکرہ
ممالک کے پہچاننے میں مشکل ہو۔ ان کے لئے یہ حلفیہ بیان دیا جاتا ہے کہ تمام واقعات
اور باتیں مغربی یورپ کے بارے میں ہیں اور صحیح ہیں۔

مغربی یورپ کے قابلِ ذکر اور اہم ممالک ہیں فرانس، اٹلی، جرمنی، انگلینڈ
اور سوئٹزرلینڈ۔ ویسے تو اور بھی ممالک ہیں لیکن وہ اتنے چھوٹے ہیں کہ ان کے
نام سنانے تک ہوائی جہاز تو کیا کار بھی ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچ جاتی ہے
پچھلے سال والے سفر میں ہم تین لوگ تھے۔ اس سال کے سفر میں دو۔
امید ہے اگلے سال والے سفر میں ہم اکیلے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اُس سفر کے
بارے میں سچ سچ بتانا ذرا مشکل ہوگا۔ (ملاحظہ ہو کرنل محمد خاں کا سفرنامہ)۔
اس لئے یہ آپ کا آخری چانس ہے (ہمارا آخری چانس اگلی بار ہوگا!)

پچھلی بار ہمارے ساتھیوں میں ایک زمیندار ریڈی صاحب تھے جنھیں دورانِ
سفر ہم 'ڈیوک آف عادل آباد' کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ پہلی بار یورپ گئے تھے۔
ہر چیز کو اور ہر شخص کو بڑے غور سے دیکھتے اور اکثر کہتے "نہیں صاحب! ہمارے
ملک والی بات نہیں۔" یہ دو دھاری تبصرہ ہر سچویشن پر ٹھیک ہوتا۔ صرف
ہمیں یہ سمجھ میں نہ آتا کہ اس ریمارک میں اپنے ملک کی تعریف مضمر ہے یا مذمت!

اٹلی بہت خوبصورت ملک ہے۔ ہندوستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ
یہ ایک امیر ملک ہے جہاں غریب لوگ بستے ہیں۔ اٹلی ایک ایسا خوبصورت

ملک ہے جہاں خوبصورت لوگ ہی بستے ہیں۔ اس ملک کے قانون کے مطابق صرف خوبصورت لوگوں کو ہی وہاں رہنے کی اجازت ہے۔ بدصورت لوگوں کو حکومت انگلستان یا جرمنی بھیج دیتی ہے۔ اٹلی میں ہم نے نسوانی خوبصورتی کے بہت سے نمونے دیکھنے کے بعد ڈیوک سے کہا "دیکھا آپ نے یہاں ایک بھی بھدّی عورت دیکھنے کو نہیں ملتی۔" ریڈی صاحب نے جواب دیا: "کیا صاحب، بہت سی عورتیں بہت موٹی اور بدصورت ہیں۔" ہم نے کہا "اچھا ریڈی صاحب اب اگر آپ کو کوئی بھدّی عورت دکھائی دے تو مجھے بتایئے۔ مجھے اپنے وطن کی یاد بہت ستا رہی ہے۔" اس معاہدے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریڈی صاحب موٹی اور بھدّی عورتوں کی تلاش میں مگن ہو گئے اور ہم بےفکری سے خوبصورت اور نازک اندام خواتین کے جلوؤں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ چار دن کے بعد ریڈی صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا جس کے بعد دوبارہ وہ ہمارے رقیب بن گئے۔

اطالوی لوگ جسم کے اعضا اور خاص طور پر شانے اور بازو ہلا ہلا کر بات کرتے ہیں، در اصل وہ اپنے اعضا زیادہ اور زبان مقابلتاً کم استعمال کرتے ہیں شاید قتیل شفائی نے ایک اطالوی غزل کا ترجمہ کر کے یہ مصرعہ لکھا تھا ؎

لحد میں بھی مرے شانے ہلائے جاتے ہیں

ہم نے ایک بار روم میں دیکھا کہ چند لوگ ایک شخص کے بازو اور کندھے باندھ رہے تھے۔ پتہ چلا کہ وہ شخص بہت بڑ بولا تھا ــــ جونہی اس کے اعضا باندھے گئے وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ سُنا ہے بیشتر اطالوی خاوند اپنی بیویوں کو ایسے ہی چپ کراتے ہیں۔

فرانسیسی بھی اطالویوں کی طرح بہت باتونی واقع ہوئے ہیں۔ انہیں کی

طرح وہ بولتے وقت اپنے جسم کے انگ ہلاتے جاتے ہیں۔ بلکہ وہ اطالیوں سے بھی ایک قدم آگے ہیں اور دوران گفتگو ان کے جسم کے کچھ زیادہ ہی حصے ہلتے ہیں۔

فرانسیسی لکھتے وقت بھی حروف کا بہت فراخدلانہ بلکہ فضول استعمال کرتے ہیں۔ لیکن شاید اپنی کثرت گوئی کا احاطہ رکھتے ہوئے انھوں نے اکثر حروف کو خاموش کر دیا ہے۔ قانوناً ہر لفظ کا آخری حرف خاموش ہوتا ہے۔ بیچ کے کئی حروف بھی خاموش رہتے ہیں۔ باقی حروف بھی صرف بڑبڑاتے ہیں۔ جو لفظ یا نام لکھنے میں بہت لمبے ہوتے ہیں، وہ تلفظ میں اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ اہل زبان کی فضول خرچی پر کبھی افسوس ہوتا ہے اور کبھی غصہ آتا ہے اور کئی بار ندامت بھی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً ہم نے ایک صاحب سے پوچھا کہ PONTEDENUEILLY کہاں ہے۔ اس نے ہماری طرف ایسے دیکھا گویا ہم جہنم کا راستہ پوچھ رہے ہیں۔ ہم نے نقشے پر لکھا ہوا نام دکھایا تو ہنس کر بولا "اوہو، پونڈی نوی PONDI NUI" اب دیکھئے اس نام کے تیرہ حروف میں سے پانچ فضول ہیں۔ اسی طرح ان کی سب سے فیشن ایبل مال روڈ کو CHMPS D' ELYSIEES چامپس ڈی ایلیزے لکھا جاتا ہے اور بولا جاتا ہے شان زلیزے SHANZILZE یعنی یہاں بھی پچاس فیصدی انفلیشن۔ یہ فضول خرچی اور انفلیشن ان کی زندگی کے ہر شعبے میں ملتی ہے۔ متذکرہ بالا مال روڈ اتنی بڑی اور چوڑی ہے کہ دہلی کی جن پتھ اور حیدرآباد کی پتھر گٹی اس کے فٹ پاتھ میں ہی سما جائے۔ اور شہروں میں اتنی کشادہ سڑک ہے ہی نہیں جس کے ساتھ موازنہ کیا جا سکے۔ وہ سارے پیرس کے حسن کی جلوہ گاہ ہے۔ شہر کے تمام عشاق وہاں بے وفائی کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ بے وفائی کی تربیت کے لئے ہر قسم کے لوگ، دکانیں اور سامان یہاں ملتے ہیں۔ یہاں دنیا کے

مشہور کیبرے CABARET، سٹرپ ٹیز STRIPTEASE اور سینماگھر ہیں۔ فرانسیسی فلموں میں سب کچھ دیکھنے کو رہتا ہے سوائے کپڑوں کے۔ کپڑے دیکھنے کے لئے آپ کو فیشن شو جانا پڑتا ہے۔ وہاں سیاح مولان روژ (MOLIN ROUGE) کریزی ہارس (CRAZY HORSE) وغیرہ ضرور دیکھتے ہیں۔ یہ ہم نے بھی دیکھا۔ بہت مایوسی ہوئی۔ اونچی دکان اور پھیکا پکوان یا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ کھودیئے پہاڑ اور پھر بھی چوہا ہی نکلے گا۔ ہماری صلاح ہے آپ ان رنگینیوں پر پیسہ مت ضائع کیجئے۔ ہم نے بھی صرف اسی لئے دیکھا کہ یہ ہمارے لئے شرط سفر تھی کہ اپنے ہم وطنوں کو بتا سکیں اور پھر ہمیں تو کسی مہربان نے یہ شو مفت دکھائے لیکن پھر بھی ہمیں اپنے میزبان کے تئیں افسوس ہوا۔ سُنا ہے اس سے بہتر شو بمبئی۔ کلکتہ اور حیدرآباد میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہم سے یہ مت پوچھئے! ہم نے جو بات سُنی وہ آپ کو بتا رہے ہیں۔

ستمبر کے مہینے میں ہر سال پیرس میں چمڑے کا بین الاقوامی میلہ ہوتا ہے۔ اس میں ہر ملک سے آئی ہوئی چمڑیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس سال اس میلہ کے ساتھ ہی عورتوں، مردوں اور بچوں کے کپڑوں؛ فیشن کے گہنے، سنگھار جواہرات اور گھریلو ضروریات کی نمائش ہو رہی تھیں۔ ان تمام نمائشوں میں صرف پیشہ ور لوگوں کو داخلے کی اجازت تھی چنانچہ ہم نے تین دن میں چھ پیشے بدلے۔ زبان نہ آنے کا یہ بھی ایک فائدہ ہوتا ہے۔ منتظمین سوال پوچھتے۔ مناسب جواب نہ ملنے پر تنگ کر کہتے اچھا جائیے صاحب آخر اتنی دور سے آئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نمائش حیدرآباد کی نمائش سے کہیں بڑی تھی۔ بس چلتے چلتے کمر ٹوٹ گئی۔ شکر ادا کیا کہ بیگم ساتھ نہیں تھیں۔ ورنہ مالی طور پر بھی کمر ٹوٹ جاتی۔

ستمبر میں پیرس جانے والے لوگ ایک سال پہلے سے ہوٹلوں میں بکنگ کروالیتے
ہیں۔ چونکہ ہم نے فیصلہ بہت دیر سے کیا تھا اس لئے کمرہ ملنے کا سوال ہی نہ پیدا
ہوتا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ہمارے سفارت خانے کے توسط سے ہمیں ایک نہایت
ہی بوسیدہ ہوٹل میں جگہ مل گئی وہاں پہنچے تو "دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا"۔
ہمیں کبھی گمان بھی نہ ہوسکتا تھا کہ پیرس میں بھی ایسے ہوٹل ہوسکتے ہیں۔ ہوٹل
کا مالک ایک خواجہ مسلمان تھا۔ ہم نے سلام کیا اُس نے ایڈوانس مانگا۔ ہم نے کہا
دنیا کا کوئی ہوٹل کسی باعزت مسافر سے ایڈوانس نہیں مانگتا۔ یہ ہماری عزت پر
حملہ ہے۔ ظاہر ہے اس ہوٹل اور اس شخص کو ابھی تک باعزت مسافروں سے پالا
نہیں پڑا تھا۔ خیر مان گیا۔ اس نے کہا آپ دونوں حضرات کے لئے ایک کمرہ خاص طور
پہ رکھا ہوا ہے۔ ہم نے اعتراض کیا کہ ہم، آج تک کسی پرائے مرد کے ساتھ ایک
کمرے میں نہیں سوئے۔ یہ ہمارے اخلاقی اصولوں کے خلاف ہے۔ اُس نے ہمیں اور
ہمارے ساتھی کو بغور دیکھا اور پھر علٰحدہ علٰحدہ کمرہ دے دیا۔ کمرے میں دیکھا تو
نہانے کے لیے تولیہ ندارد۔ ہم نے مالک کو بلایا۔ اس نے ایک پتلے سے نیپ کن
کی طرف اشارہ کیا اور کہا یہ رہا تولیہ۔ ہم نے کہا اس سے بہتر تو ہمارا رومال ہے
اسے تولیہ کون کہہ سکتا ہے۔ اس نے بڑے فخر سے جواب دیا کہ پچھلے چار برس سے
میں اسی سے بدن پونچھتا آرہا ہوں۔ ہم نے کہا بے شک اگر ہم بھی چار سال تک اس
کپڑے سے بدن پونچھتے رہیں تو ہمارا جسم بھی سوکھ جائے گا۔ لیکن ہم تو صرف تین
دن رکنے والے ہیں اور تین دن میں تو اس سے صرف منہ پونچھا جاسکے گا یا جسم کا
اس سے بھی چھوٹا کوئی حصہ۔ اس بات پر اس نے ہمیں ایک اور چار گرہ کپڑا لاکے
دیا جسے وہ تولیہ کہنے پر مصر تھا۔ خیر اس سے تین دن میں بدن پونچھنے کے مقصد

میں ہم کامیاب ہو گئے۔

یورپ میں پھل بڑے تازہ اور میٹھے ہوتے ہیں کیونکہ اکثر وہ بحرِ روم MEDITERANNEAN SEA کے نواحی ملکوں سے آتے ہیں۔ فرانس کے اپنے پھل بھی بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ ایک بار ہم نے ایک بڑا خوبصورت سا سیب خریدا۔ کھانے لگے تو معلوم ہوا کہ وہ آلوچہ ہے۔ وہاں کا تربوز سُرخ اور میٹھا ہوتا ہے ایک دکان پر ہم نے تربوز کی پھانک دیکھ کر پوچھا "کیا یہ میٹھا ہوگا؟" دکاندار نے بڑی حیرانی سے ہماری طرف دیکھا اور پھر پوچھا "کیا کہیں پھیکا تربوز بھی ملتا ہے؟" ہم نے اسے فوری ہندوستان آنے کی دعوت دی تاکہ وہ خود دیکھ لے کہ ہمارے ملک میں ہر قسم کی پھیکی چیز ملتی ہے۔ یہاں آکر اگر اس نے وہی سوال پوچھا تو جواب ملے گا "حضور ہم نے تربوز کے اندر گھس کر تو دیکھا نہیں۔ قدرت کی پیداوار ہے۔ اب انسان کو ہی دیکھئے کوئی چھوٹا کوئی موٹا کوئی اچھا کوئی بُرا۔"

ایک بار ہم نے ہندوستان میں ایک تربوز فروش سے یہی سوال پوچھا تھا تو اُس نے جواب دیا "دیکھتے نہیں اس پر کتنی مکھیاں بیٹھی ہیں۔ اگر میٹھا نہ ہوتا تو کیا یہ مکھیاں پاگل ہیں جو یہاں آکر بیٹھتی ہیں؟" ایسے موقعوں پر ریڈی صاحب کا جملہ یاد آجاتا ہے "نہیں صاحب، ہمارے ملک والی بات نہیں" کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ع

سارے جہاں سے نیارا ہندوستان ہمارا

یورپ کے ٹیکسی ڈرائیور بھی اپنی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہماری ٹیکسیاں اور ڈرائیور دونوں ہی پھٹیچر ہوتے ہیں۔ وہاں ٹیکسی ڈرائیور مُسافر سے زیادہ سمارٹ ہوتا ہے۔ ہر ٹیکسی میں دائرلیس لگا ہوتا ہے۔ ہمارے ڈرائیور اور وہاں کے ڈرائیور کی ایک خصلت مشترکہ ہے۔ دونوں مسافر کو حتی الامکان لوٹنے

سے احتراز نہیں کرتے۔ جرمنی میں عورتیں ٹیکسی چلاتی ہیں لیکن اپنی حفاظت کے لئے عموماً ایک خونخوار قسم کا کتا اپنے ساتھ رکھتی ہیں۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اپنی زبان باہر لٹکائے ہا ہا ہا ہا کرتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے دنیا کے تمام کتے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہماری نظر اگر کبھی خاتون ڈرائیور پر پڑ جاتی تو کتا فوراً غرانے لگتا۔ اور ڈرائیور شیشے سے ہماری طرف دیکھ کر بغیر منہ موڑے مسکرانے لگتی۔ ہم بہت کنفیوزڈ ہو جاتے کہ اسے کس بات کا اشارہ سمجھیں۔ عافیت اسی میں نظر آتی کہ غیر جانبدارانہ پالیسی اپنا کر اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھیں۔

جرمنی میں سب لوگ جرمن بولتے ہیں۔ اٹلی میں اطالوی اور فرانس میں فرنچ۔ ہندوستان کے باہر یورپ میں صرف انگلستان ہی ایسا ملک ہے جہاں لوگوں کو انگریزی آتی ہے۔ انگلستان میں تو بچے بچے کو انگریزی آتی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنے ملک میں پہنچ گئے ہیں۔ وہاں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اب ہند و پاک کے لوگوں کو بھی پولیس میں بھرتی کیا جاتا ہے۔ براڈ فورڈ میں اتنے پاکستانی ہیں کہ اس کو پاکستان کا دوسرا دارالخلافہ مانا جاتا ہے۔ جب ۱۹۶۷ء میں ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ہوئی تھی تو اس وقت کے وزیر اعظم ہند لال بہادر شاستری نے پاکستان کے صدر ایوب کو یہ دھمکی دی تھی کہ اگر لڑائی بند نہ کی تو ہم براڈ فورڈ پر بم گرائیں گے۔ یہ سن کر برطانیہ کا وزیر اعظم ولسن بھی ڈر گیا اور اس نے ایوب کو سمجھا بجھا کر جنگ بندی کرا دی۔

ساؤتھ ہال انگلینڈ کا جالندھر ہے۔ وہاں ہم نے چھولے بٹورے کھائے اور لسی پی۔ وہاں ہم نے یہ بھی معلومات حاصل کیں کہ ایسی چیزیں ہندوستان میں کہاں کہاں ملتی ہیں۔

ہم نے اپنی چڑھتی جوانی میں فرنچ سیکھی تھی۔ اب جو ڈھلتی جوانی میں فرانس پہنچے تو فرنچ بولنے کی کوشش کی لیکن فرنچ کی بجائے تلگو کے الفاظ امڈ کر آنے لگے۔ آندھرا میں ہم بمشکل تلگو میں بات کر پاتے ہیں لیکن فرانس میں ایسا محسوس ہوا گویا ہم تلگو پنڈت ہیں۔ نتیجتاً ہم اہل فرانس کو تلگو کے چند الفاظ سکھا آئے (جو اب ہم مستقلاً بھول گئے ہیں) اس طرح ہم کلچرل ایکسچینج کا کام بھی کر آئے اب کبھی کوئی آندھرا کا دوست ہم سے تلگو میں بات کرتا ہے تو ہم اس کو کہتے ہیں بھئی یہاں نہیں ہم سے پیرس میں ملئے۔

پیرس میں دو ہوائی اڈے ہیں۔ ہر ایک ایر پورٹ کے پاس ہولی ڈے ان HOLIDAY INN کا ایک ایک ہوٹل ہے۔ یہ ہوٹل ایر پورٹ پہ ان مسافروں کے لئے جو وہاں ٹھیرنے والے ہوں ایک وین بھیجتا ہے۔ ہماری ریزرویشن بھی ہولی ڈے ان میں تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہم غلط ہوٹل میں آگئے ہیں۔ ہمیں دوسرے ایر پورٹ کے قریب والے اسی نام کے ہوٹل میں جانا تھا۔ اس ہوٹل کی ویان ہمیں واپس ایر پورٹ چھوڑنے آئی۔ ہم نے بطور ٹپ ویان ڈرائیور کو پانچ فرینک جو تقریباً دس روپے کے برابر ہوتے ہیں دیئے اور ساتھ ہی اس کا شکریہ وصول کرنے کی تیاری میں اپنے چہرے پر ایک مسکراہٹ بھی بکھیر دی۔ بجائے شکریہ ادا کرنے کے اس نے نہایت حقارت اور غصے سے ہماری طرف دیکھا۔ ہماری دی ہوئی رقم واپس کر دی اور اپنی جیب سے دس فرینک کا نوٹ نکال کر ہمارے کھلے ہوئے ہاتھ میں تھما دیا اور ساتھ ہی تیز اور گرم آواز میں کچھ آشیرواد بھی دیا گیا۔ ہمارے ساتھی نے کہا بھئی کمال ہے یہاں کے ڈرائیوروں کو یہ احساس ہے کہ ہمارے پاس فارن ایکسچینج کی کمی ہے۔

اس نے ہمیں یہ رائے دی کہ اگر ہم ہر جگہ ایسا ہی کریں یعنی کم ٹپ دیں تو ہمارے پاس فارن ایکسچینج کافی جمع ہو سکتا ہے۔ ہم نے فرانسیسی ڈرائیور کو تلگو میں دو یہ وادھم کہہ کر وہ نوٹ جیب میں ڈال لیا۔ سرزمین فرانس میں ہماری یہ پہلی کمائی تھی۔

یورپ کے ہر ایرپورٹ پر تفریح کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ بیشتر ہوائی اڈوں پر سیکس شاپ ہیں جہاں جنس سے متعلقہ ہر چیز مل جاتی ہے۔ پچھلے چند برسوں سے ایک معصوم تفریح یہ بھی مہیا کی گئی ہے کہ بچوں کے لئے کھلونے کی طرح کی TROLLEYS بکثرت ملتی ہیں۔ بڑے بوڑھے ہر قسم کے لوگ ان میں اپنا سامان لاد کر ادھر ادھر گھومتے پھرتے ہیں لیکن TROLLEYS چلاتے وقت بجائے کسی طرح کے احساس کے وہ لوگ غم و فکر میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

واپسی پر ہم اٹلی کے اس شہر میں دو دن کے لئے رکے جہاں حال ہی میں ہماری بیٹی اعلیٰ تعلیم کے لئے گئی تھی۔ وہاں ہم نے ایک اتنا خوبصورت نوجوان دیکھا کہ ہم سمجھے یہ دنیا کا خوبصورت ترین شخص ہوگا۔ ہم نے جب اپنی بیٹی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ دنیا کا دوسرا خوبصورت ترین شخص ہے۔ ہم نے پوچھا کہ پہلا نمبر کس کا ہے۔ وہ ہمیں آئینے کے سامنے لے گئی اور کہنے لگی۔ لو دیکھ لو۔ وہاں ہمیں وہی شبیہہ دکھائی دی جو روز شیو کرتے وقت دکھائی دیتی ہے سمجھ گئے کس باپ کی بیٹی ہے (آپ سے پوچھ نہیں رہا، مجھے معلوم ہے۔ آپ کو بتا رہا ہوں)

ہماری بیٹی کی لینڈ لیڈی، ایک طلاق یافتہ لیڈی ڈاکٹر ہے" جس کی عمر ابھی پینتیس برس کی نہیں ہوئی۔ اس کی دو بچیاں ہیں جو اس کے پاس رہتی ہیں۔ اس کا خاوند اکثر شام کو آتا ہے۔ بچوں کو باہر لے جاتا ہے۔ پھر سب لوگ کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ گڈ نائٹ کہہ کر کہیں چلا جاتا ہے۔ طلاق کا یہ مہذب سسٹم ہمیں بہت

پسند آیا۔ لینڈ لیڈی کو جب پتہ چلا کہ ہم آرہے ہیں تو اس نے ہماری بیٹی سے کہا کہ تمہارے والد یہاں ٹھیر سکتے ہیں۔ شام کو جب ہم وہاں پہنچے تو اس نے ہماری بیٹی کو اطالوی میں بتایا کہ تمہارے والد میرے بیڈروم میں سوئیں گے۔ ہماری بیٹی نے اس کا ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ترجمہ کر دیا۔ ہم قدرتی طور پر جھینپ گئے۔ افسوس ہوا کہ ہم نے اگر فرنچ کی بجائے اطالوی زبان سیکھی ہوتی تو ایسے نازک معاملے میں بیٹی سے ترجمہ کروانے کی بجائے راست بات کر سکتے تھے۔ اس دن ہمیں پہلی بار اطالوی مہمان نوازی کا اندازہ ہوا۔ ہم نے معذرت چاہی کہ ہم بیٹی کے کمرے میں ہی سو جائیں گے یا پھر بیٹھک میں صوفے پر یا زمین پر ہی۔ لیکن وہ مُصر تھی۔ پھر اُس نے یہ وضاحت کی کہ ہم اُس کے بیڈروم میں سوئیں گے اور وہ بیٹھک میں۔ اُس نے بتایا کہ وہ رات کو پڑھتی ہے اور اُسے بیٹھک میں ہی سونا زیادہ پسند ہے اور وہ اکثر ایسا کرتی تھی تب ہماری کچھ سمجھ میں آنے لگا کہ اس کے خاوند نے اس کو طلاق کیوں دی ہوگی۔ اس رات ہمیں رات بھر نیند نہیں آئی۔ مچھروں نے خوب ستایا۔

پھر کوچ کا وقت آگیا۔ اس بار ہمارا دل یورپ چھوڑنے کے لئے بالکل آمادہ نہیں تھا۔ بار بار بیٹی کا وہ اُداس چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا رہا جو ہم نے بولونیا میں دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اپنے دل کا ایک حصّہ وہیں چھوٹ گیا ہے اور تھا بھی سچ۔ زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ بیٹی کتنی عزیز ہوتی ہے۔ اب اس کی وہی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومتی ہے اور ہم اس فکر میں مبتلا ہیں کہ اس سے دوبارہ کب مل سکیں گے۔ اب ہم یورپ نہیں جانا چاہتے۔ بس اس خطۂ زمین پر جانا چاہتے ہیں جہاں ہماری آنکھوں کا نور ہمارے جگر کا ایک ٹکڑا رہ گیا ہے۔ ■■

کھیل دو قسم کے ہوتے ہیں ، ایک وہ جو گھر کے اندر کھیلے جائیں
ایسے کھیل ایک ساتھی کے ساتھ یا دو اور دو سے زیادہ کے ساتھ بھی
کھیلے جاتے ہیں ۔ اس کا انحصار گھر کے سائز پر ہے ۔ عام طور پر اگر گھر
چھوٹا ہو تو اجتماعی کھیل ہی کھیلنے کو ملتے ہیں ۔ دوسری قسم ان کھیلوں کی
ہوتی ہے جو گھر کے باہر کھیلے جائیں ۔ وہ کسی اور کے گھر کے سامنے کھیلے
جاسکتے ہیں یا گھروں سے دور ۔ جنگلوں میں ، پہاڑوں میں ۔ آبشاروں
میں یا کھلے چٹیل میدانوں میں ۔ لیکن ہماری صلاح ہے کہ ایسے کھیل
بہت سے لوگوں کے ساتھ مل کر ہی کھیلے جانے چاہئیں ورنہ خواہ مخواہ
پکڑے جانے کا اندیشہ رہتا ہے ۔

نیّت یا ذہنیت کے لحاظ سے کھیل دو قسم کے ہوتے ہیں ، ایک
اپنا دل بہلانے کے لیے اور دوسرے اَوروں کا دِل دکھانے کے لیے
کئی کھیل ایسے ہوتے ہیں جن میں بیک وقت مندرجہ بالا دونوں قسمیں

پائی جاتی ہیں مثلاً محبت ۔ ایسے کھیل کے بارے میں غالب نے شکایت کی تھی ؎

کھیل سمجھا ہے مجھے چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یُوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

ذرا اور سوچئے تو آپ کو کھیلوں کی دو اور قسمیں دکھائی دیں گی ۔ ورزشی کھیل اور غیر ورزشی کھیل یا تفریحی کھیل یہ زیادہ پاپولر ہوتے ہیں ۔ اگر کسی شخص کو کھیل سے دور رکھنا ہو تو آپ اُسے کہہ دیں کہ یہ تو ورزشی کھیل ہے ۔ یعنی اس سے جسم مضبوط ہوتا ہے ۔ وہ شخص فوراً کھیل کھیلنا چھوڑ دے گا ۔

ادب کی طرح عموماً لوگوں کو کھیل میں بھی مقصدیت پسند نہیں ۔ ادب برائے ادب ۔ کھیل برائے کھیل ۔

اس کے علاوہ کھیل تین قسم کے ہوتے ہیں ۔ ایک وہ جو اکیلے کھیلے جائیں ، دوسرے وہ ، جو صرف ایک ساتھی کے ساتھ کھیلے جائیں ۔ ذرا صبر سے کام لیں تو میں اس کی مثال بھی دے دیتا ہوں ورنہ آپ کچھ اور ہی نہ سمجھ بیٹھیں مثلاً کُشتی ۔ تاش ۔ شطرنج ۔ تیسری قسم ایسے کھیلوں کی ہوتی ہے جو بہت سے لوگوں کے ساتھ کھیلے جائیں مثلاً سیاسی جلسہ یا دنگا فساد وغیرہ ۔

تہذیب کے آغاز پر ایسے کھیل ایجاد کیے گئے تھے جن پر خرچ کم آتا تھا لیکن جسم کو ضرر زیادہ پہنچتا تھا مثلاً کُشتی ، کبڈی ۔ تکہ بازی وغیرہ ان کھیلوں کو جب عوام نے غصب کر لیا تو خواص نے چند اور کھیل ایجاد

کر لیے، جن پر خرچ زیادہ آتا ہے اور جسمانی نقصان یا فائدہ ندارد۔

دُنیا کے زیادہ تر کھیل گیند کے گرد گھومتے ہیں۔ چھوٹی گیند۔ بڑی گیند نرم گیند۔ سخت گیند ٹھوس گیند۔ ٹاپو گیند۔ ہوا والی گیند۔ کھوکھلی گیند دنیا میں گیند کی ایسی کوئی قسم نہیں جو کھیلے جانے سے بچی ہو۔ ہاتھ سے پاؤں سے، بلّے سے، چھڑی سے، ہر طرح گیند کی دُرگت بنائی جاتی ہے۔

جو کھیل عموماً امیروں کے کہلاتے ہیں، وہ دراصل امیروں نے غریبوں کے لیے ہی بنائے ہیں۔ آپ کسی بھی امیر کھیل جیسے کرکٹ، ٹینس بلیرڈ۔ گولف کا تجزیہ کر کے دیکھ لیں ــــ چلئے سب سے پہلے کرکٹ کے میدان کی طرف چلتے ہیں۔

کرکٹ کا کھیل کھلاڑیوں کے لیے نہیں بلکہ تماشائیوں کے لیے ایجاد کیا گیا ہے۔ اس کے لیے پیشہ ور کھلاڑی ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ کھلاڑی سفید پوش ہوتے ہیں اور عموماً انہیں اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ کھیل تین دن تک چلتا رہتا ہے۔ کھلاڑیوں کی پوشاک دیکھنے ہزاروں بلکہ لاکھوں تماشائی آتے ہیں تاکہ یہ فیصلہ ہو سکے کہ کس کے کپڑے سب سے زیادہ سفید ہیں اس سے کپڑے دھونے کا صابن بنانے والی کمپنیوں کا بڑا فائدہ ہوتا ہے اس کھیل میں ایک گیند، دو بلّے، تین وکٹیں، بائیس کھلاڑی اور ہزاروں بلکہ لاکھوں تماشائی ہوتے ہیں۔ کرشن چندر کے ایک ناول کا نام ہے ــ " ایک عورت، ہزار دیوانے " کرکٹ کا دوسرا نام ہے " ایک گیند لاکھ شیدائی "۔ شہر کے تمام گمشدہ بچے، مفرور مجرم اور آوارہ نوجوان

کرکٹ کے تماشائیوں میں پائے جاتے ہیں۔ نوجوان جوڑے جنھیں کوئی گوشۂ تنہائی نہیں ملتا۔ یہاں آ کر رومانس کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں سب تماشائی ایک دوسرے سے بے خبر صرف گیند ہی کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس طرح ہجوم میں تنہائی، جلوت میں خلوت کا سماں رہتا ہے۔ ہاں بے چاری گیند کوئی عشق نہیں کر سکتی۔ پھر بھی اس کی خوب پٹائی ہوتی ہے۔

ہم ایک بار کرکٹ میچ دیکھنے گئے۔ بہت دیر تک بیٹھے رہے لیکن میچ شروع ہی نہ ہو سکا۔ جونہی ہم داخل ہوئے، ریفری نے سیٹی بجائی اور کھیل شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ سیٹی کا بجنا تھا کہ ایک کھلاڑی جسے بولر بتایا گیا تھا، انتہائی غصّے میں دوڑتا ہوا آیا اور دوسرے کھلاڑی کو گیند سے مارنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ ڈرپوک کھلاڑی وکٹوں کے پیچھے دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس کا نام وکٹ کیپر ہے۔ وہ یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے پرانی وضع کے لوگ دیوار گیلی کرتے وقت بیٹھتے ہیں۔ ہمیں اس کی بے شرمی پر تعجب ہوا کہ ہزاروں لوگوں کے سامنے ایسا کام کر رہا ہے۔ ایک ناتوان قسم کا کھلاڑی جو اپنا تمام بوجھ بلّے پر ڈال کر بمشکل تمام کھڑا ہوا تھا وکٹ کیپر کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بولر پکّے ارادے کا ظالم قسم کا شخص لگتا تھا۔ ریفری پہلے تو خاموش کھڑا رہا۔ چھ بار کوشش کرنے کے باوجود بھی بولر اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تو آخر ریفری کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، اس نے سیٹی بجا کر ہاتھ کے اشارے سے اسے دفع ہونے کا حکم دیا۔ اس کھلاڑی کی جگہ جو دوسرا شخص آیا تو اس نے بھی وہی حرکت کرنی شروع کر دی۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ اس جگہ

جو شخص بھی آتا ہے اس پر وہی جنون طاری ہوجاتا ہے۔ ریفری نے بار بار سب کو آزمایا لیکن اسے ایک بھی شریف کھلاڑی نہ مل سکا۔ سب نے وہی حرکت کی۔ آخری کھلاڑی تو ایک بار اپنے مقصد میں تقریبًا کامیاب بھی ہوگیا۔ لیکن وہ نحیف و ناتوان بلّے والا کھلاڑی جو نہ کرسکا وہ کام وکٹوں نے کیا۔ یعنی گیند روک کر وکٹ کیپر کو چوٹ سے بچالیا۔ بلّے والے کی اس نااہلی پر ریفری بڑا ناراض ہوا اور اُس نے اُس کو میدان سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ لیکن تماشائی بولر کی اس حرکت پر بڑے خوش ہوئے۔ سارا میدان تالیوں، سیٹیوں اور ہر قسم کے شور سے گونج اُٹھا۔ چند تماشائیوں نے کاغذی ٹوپیاں اُچھالنا شروع کردیں۔ کچھ نوجوان، وحشی انداز میں ناچنے لگے۔ چند حسیناؤں نے دور سے ہی ہوائی بوسے پھینکے۔ چند منچلے بھاگ کر میدان میں داخل ہوگئے۔ پھر فوراً پولیس والے بھی آگئے اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

یہ نظارہ دیکھ کر ہمیں وہ زمانہ یاد آگیا جب سلطنتِ روما کے دور میں عیسائیوں کو شیر کے آگے پھینکا جاتا تھا اور ہزاروں مرد، عورتیں اور بچّے بڑی بے دردی سے تالیاں بجا بجا کر بربریت کے اس مظاہرہ کا مزہ لیتے تھے۔ اتنی صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی انسان کا وحشی پن کچھ کم نہیں ہوا۔ ہم بور اور ناراض ہوکر واپس آگئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ٹسٹ (یعنی آزمائشی) تھا اور وہ ٹسٹ تین دن تک چلتا رہا اس کے بعد دونوں فریقین نے کھیلنے کا ارادہ ترک کردیا۔ اس کے بعد ہم کبھی کرکٹ دیکھنے کبھی نہیں گئے۔ کرکٹ کے کھیل کا صرف ایک

پہلو ہمیں پسند آیا وہ ہے تعلیمی۔ محکمۂ تعلیم بالغان، ہزاروں، لاکھوں ان پڑھ اور بے کار لوگوں کے اجتماع سے فائدہ اٹھا کر میدان کے ایک کونے میں ایک دیو ہیکل بلیک بورڈ آویزاں کر دیتا ہے۔ اس کے ذریعہ انگریزی کے ہجے اور ریاضی کی تفریق و جمع کے سوالوں کے حل سکھائے جاتے ہیں۔ اس طرح ہمارے ملک کے تعلیمی پروگراموں کو فروغ ملتا ہے۔ آزادی کے بعد ہمارے ملک کی خواندگی اور حرف شناسی میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی ایک بڑی وجہ کرکٹ کی مقبولیت باور کی جاتی ہے۔ کچھ لوگ غلط الزام تراشی کرتے ہیں کہ یہ امیروں کا کھیل ہے۔ ذرا خود ہی سوچئے۔ اسے دیکھنے لاکھوں تماشائی جمع ہوتے ہیں۔ اگر ہندوستان کے شہروں میں واقعی اتنے امیر لوگ ہوتے تو ہمارا ملک دُنیا کے امیر ترین ملکوں میں شامل ہوتا۔

ایسا ہی ایک کھیل ٹینس ہے۔ سنگلز ہو تو دو اور ڈبلز ہو تو چار صاحب لوگ نام نہاد کھلاڑی بنتے ہیں۔ اصلی کھیلنے والے چار پانچ غریب بچے ہوتے ہیں جنہیں "چھوکرا" یا "بوائے" یا "گولی" پکارا جاتا ہے صاحب لوگ ان بچوں کی دلجوئی کے لیے گیند کبھی ادھر کبھی اُدھر پھینکتے ہیں اور وہ چھوکرے خوب لطف اٹھاتے ہیں۔ مزے کی بات یہ کہ صاحب لوگوں کو گیند کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی تاکہ گیند میں جراثیم نہ آجائیں۔ صاحب لوگ بلّا استعمال کرتے ہیں اور چھوکرے خالی ہاتھ سے کھیلتے ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں صاحبوں کو سفید یونیفارم میں آنا لازمی ہے۔ وہاں چھوکرے اپنی مرضی اور موڈ کے مطابق پوشاک

پہن کر آسکتے ہیں۔ اگر کبھی صاحب یونیفارم میں نہ آئیں تو چھوکرے ناراض ہوکر کھیل چھوڑ دیتے ہیں۔

اسی طرح گولف بھی اصل میں غریب چھوکروں کی دلجوئی کے لیے ایجاد کیا گیا ہے۔ اس کھیل میں انہیں اکثر "کیڈی" پکارا جاتا ہے۔ اس کھیل کو اُردو میں ٹیڑھی بھی کہا جاتا ہے یہ کھیل اس لیے ایجاد کیا گیا ہے کہ جو لوگ سیدھے سادھے طور پہ سیر کرنا پسند نہ کریں انہیں اس ٹیڑھے طریقے سے چار پانچ میل کی سیر کروادی جائے۔ اس کھیل میں (۱۹) گچیاں ہوتی ہیں اور دونوں فریقین کے کھلاڑیوں کو اپنی اپنی گولی باری باری ایک گچی میں ڈالنی ہوتی ہے۔ ایسا کرتے کرتے پانچ چھ گھنٹے کا وقت اور چار پانچ میل کی مسافت طے ہو جاتی ہے۔ ایک گھنٹے میں ایک میل یعنی کچھوے کی رفتار۔ اس کھیل میں خرگوشوں کو کھیلنے کی اجازت نہیں ہوتی کیونکہ وہ روایتی داستان کے مطابق کچھوؤں سے سست رفتار واقع ہوئے ہیں۔

ہر صاحب کے ساتھ دو یا تین کیڈی ہوتے ہیں۔ ایک ڈنڈے اٹھاتا ہے، دوسرا گیند پہ نظر رکھتا ہے۔ تیسرا چھوکرا پہلے، یعنی سینیر چھوکرے کا چھوٹا بھائی یا چچیرا بھائی یا بھتیجا ہوتا ہے جو انڈر ٹریننگ رہتا ہے۔ وہ سپیئر وہیل (SPARE WHEEL) کی طرح ساتھ ہولیتا ہے تاکہ ضرورت پڑے تو وہ چھوکروں یا صاحب کی جگہ پوری کر سکے۔ صاحب جب گیند کو چھڑی سے مارتا ہے تو چھوکروں کو لازم ہے کہ وہ اس "ہٹ" کی تعریف کریں لیکن تعریف ایسے طریقے سے کرنی چاہیئے کہ وہ چاپلوسی نہ لگے۔

تعریف کے لیے سٹینڈرڈ الفاظ اور خطبے بنائے گئے ہیں مثلاً واہ ۔ واہ، حیرت انگیز (WONDER FUL) شاباش (WELL DONE) شاندار مرحبا وغیرہ، اگر ہٹ ٹھیک نہ ہو یا صاحب کو کھیلنا نہ آتا ہو تو آداب کھیل کا تقاضا ہے کہ اس میں صاحب کا قصور نہیں جتلایا جاتا ۔ اس کو بدقسمتی سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ ہوا پر الزام لگایا جا سکتا ہے یا گھاس کو کوسا جا سکتا ہے یا پھر چھڑی کے ٹیڑھے پن کو ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے ۔ صاحب کو بھی ایسے موقع پر غصہ، ندامت اور پریشانی کے ملے جلے جذبوں کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے ۔ اُسے لازم ہے کہ وہ دانت پیس کر یسوع مسیح (JESUS) کا نام لے یا پھر خونی جہنم (BLOODY HELL) یا بیل کی لید BULL SHIT یا صرف انسان کے گوہ (SHIT) یا چار حروف پر مبنی الفاظ، غیر مہذب اور فحش اصطلاحیں انگریزی میں استعمال کرے ۔ اس کا مقصد ان غریب چھوکروں کو بامحاورہ اور چٹپٹی انگریزی بولنا سکھانا ہے ۔ گویا ان بچوں کے لیے گولف ایک ایسا مدرسہ ہے جہاں کھیل کھیل میں پڑھائی ہو جاتی ہے ۔ اس کھیل کی ایک اور روایت ہے کہ ہر کھیل میں چھوکرے کم از کم ایک گیند گم کر دیتے ہیں ۔ اگلے دن وہی گیند کسی اور صاحب کو آدھے یا پون داموں پر بیچ دی جاتی ہے ۔ کبھی کبھی وہ گیند اصلی مالک کو ہی "ڈھونڈ" کر واپس کر دی جاتی ہے ۔ وہ صاحب بطور شکریہ یا تو اسے خرید لیتا ہے یا چھوکروں کو انعام یا بخشش دیتا ہے ۔ کھیل کے دوران صاحب اور چھوکروں کی گپ شپ چلتی رہتی ہے ۔ چھوکرے صاحب کو دوسرے صاحبوں کے سکینڈل بناتے ہیں ۔ شہر اور ملک کی سیاست کے بارے میں تازہ ترین خبریں مہیا

کرتے ہیں اور کھیل کے سٹینڈرڈ کے بارے میں بھی تبصرہ کرتے ہیں۔ اگر صاحب تمباکو نوش ہو تو اکثر چھوکروں کو سگریٹ یا بیڑی مفت مل جاتی ہے جہاں نشہ بندی ہو، وہاں رم وغیرہ بھی مل جاتی ہے۔ کھیل کے اختتام پر سب چھوکروں کو "ٹپ" ملتا ہے۔ کئی فراغ دل صاحب تو ۲۰۔۲۵ روپے تک لٹا دیتے ہیں۔

تو دیکھا آپ نے! "غریب" چھوکروں کی سیر بھی ہو گئی۔ تفریح بھی ہو گئی، روزمرہ انگریزی میں تعلیم بھی ہو گئی۔ شرفا کی صحبت بھی مفت مل گئی اور ان سب کے علاوہ کچھ پیسے بھی مل گئے۔ اس کے برعکس امیر آدمی کو کیا ملا؟ غریب چھوکروں کی صحبت۔ گیند کا گم ہو جانا، پھر پیسوں کا نقصان۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ کھیل کس کے لیے زیادہ مفید ہوا۔ امیروں کے لیے یا غریبوں کے لیے؟

اس کے برعکس آپ غریبوں کے مخصوص کھیل دیکھئے ـــــ کبڈّی گلّی ڈنڈا وغیرہ۔ اُن میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ ہینگ اور پھٹکری تک نہیں لگتی (ہاں اگر چوٹ لگ جائے تو تھوڑی سی پھٹکری لگانی پڑتی ہے) اور پھر ورزش بھی خوب ہوتی ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ گالف جیسے کھیلوں کے برعکس جس میں امیروں کو لازم ہوتا ہے کہ غریبوں کو کھلائیں۔ اِن کھیلوں میں ایسی کوئی مجبوری نہیں۔ ان میں کسی امیر کو پاس پھٹکنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ویسے ہی وہ ڈر کے مارے خود ہی دور رہتے ہیں۔ غریبوں کے کھیلوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے بعد بھوک خوب چمکتی ہے لیکن چونکہ کھانے کو کافی نہیں ہوتا اس لیے انسان

موٹا نہیں ہوتا۔ گولف اور ٹینس میں یہ نقص ہے کہ کھیلنے کے بعد بھوک مٹانے کے لیے امیر لوگ زیادہ کھا لیتے ہیں۔ اس طرح کھیل کا سارا اثر زائل ہو جاتا ہے اور اکثر کھلاڑیوں کی صحت خراب رہتی ہے۔ غالبؔ نے یہی بات سامنے رکھ کر کہا تھا ـــ

تنگدستی ہزار ہو غالبؔ ـــ تندرستی ہزار نعمت ہے

کھیل اس لیے ایجاد کئے گئے ہیں کہ فطری طور پر انسان کا دل کام میں نہیں لگتا۔ اس لیے کئی ماہروں نے کام کو بھی کھیلوں کی طرح انجام دینے کے کئی طریقے نکالے ہیں۔ ویسے بھی جو شخص کام میں اچھا ہو اس کے بارے میں اکثر سننے میں آتا ہے کہ وہ تو کام کو کھیل سمجھتا ہے اور جو نہایت ہی محنتی شخص ہو کام اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔

اپریل فول

ہندوستان تہواروں کا ملک ہے۔ یہاں ہر روز کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی تہوار منایا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد ہماری قومی حکومت کو جن بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑا، اُن میں تہواروں کا مسئلہ بھی تھا۔ ہر تہوار کے منانے والے اُس دن چھٹی چاہتے تھے۔ اُن تہواروں کی فہرست بنائی گئی تو پتہ چلا کہ اگر ہر تہوار پر چھٹی دی جائے تو ایک سال کی مدّت بھی کافی نہ ہوگی، کچھ دن اور امپورٹ کر کے سال کو طویل کرنا پڑیگا۔ ایک تجویز یہ بھی رکھی گئی کہ

بدیشی سال کے بجائے اپنا ایک دیسی سال شروع کیا جائے جس میں سب چھٹیاں سما جائیں لیکن ناپنے پر وہ بھی چھوٹا نکلا۔ آخر بادلِ ناخواستہ سرکار کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ صرف چند تہواروں پر ہی چھٹیاں دی جائیں۔

تہوار کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ہر فرقے کا، ہر مذہب کا، ہر خطّے کا، ہر موسم کا، ہر زبان کا اپنا تہوار ہوتا ہے۔ اگر ہم اس بحث میں پڑ گئے کہ تہوار کب، کیوں

اور کیسے شروع ہوئے تو ہماری باقی ماندہ زندگی اسی تحقیق میں گزر جائے گی اور کام پھر بھی ختم نہ ہوگا۔ ہاں ایک بار ہم نے اس طرح کی تحقیق کا بیڑا اٹھانے کا ارادہ کیا اور جب ہم نے تمام تہواروں کا سرسری طور پر جائزہ لیا تو ایک تہوار ایسا نظر آیا جس کا تعلق کسی خطّے سے، نہ کسی فرقے سے، نہ کسی موسم سے اور نہ کسی زبان سے ہے۔ وہ بے چارا اکیلا ایک طرف کھڑا تھا اُس کے چہرہ پر معصومیت کی چھاپ تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ ہمیں بڑا بھایا، لیکن ہم نے اپنے احساسات کو چھپاتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے اُسے اپنی طرف بلایا اور پوچھا:

"کیوں میاں تم کون ہو؟"

"مجھے یکم اپریل کہتے ہیں۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"یوروپ سے آیا ہوں۔"

یہ سُن کر ہم بہت مرعوب ہوگئے۔ کیونکہ ہم ہندوستانی اہلِ یورپ سے بہت مرعوب ہو جاتے ہیں۔ ہم اُٹھ کر اُسے اپنی کرسی پیش کرنے ہی والے تھے کہ کسی نے ہمارا کندھا ہلاتے ہوئے کہا "یہ کیا بات ہوئی، یوروپین ہے تو کیا ہوا اب تو تم یورپ کے غلام نہیں۔ آزاد ملک کے باشندے ہو۔" اس غیبی آواز سُن کر ہمیں گویا خود اعتمادی کا انجکشن لگا۔ ہم نے پورا سانس لے کر اپنا سینہ تانا اور پھر گویا ہوئے۔

"یوروپین ہوئے تو کیا؟ یہاں کب آئے تھے؟"

"انگریزوں کے ساتھ ہی آیا تھا۔"

انگریزوں کا نام سُنا تو پھر ایک بار ہماری سانس پھُول گئی۔ یہ ہمارے سابق

آقاؤں کے ساتھ آیا تھا۔ اس کی عزت کرنی چاہیئے۔ قدر و منزلت ہونی چاہیئے لیکن اُس کم بخت غیبی آواز نے پھر منع کیا۔ "گھبراؤ مت۔ سوال جاری رکھو، اپنے کام سے گریز مت کرو۔"

"ویری گڈ" ہمارے مُنہ سے بغیر ہماری اجازت کے نکل گیا۔ یہ بھی ہم نے انگریزوں سے ہی سیکھا تھا کہ جب کوئی اور بات نہ سوجھے یا سانس لینے کی ضرورت ہو تو "ویل" یا "ویری گڈ" یا "آئی سی" کہہ دو۔ اس سے سوچنے کی مہلت مل جاتی ہے۔ واقعی ان دو لفظوں کو ادا کرنے میں ایک اور سوال ہمارے ذہن میں آگیا۔

"تو پھر تم انگریزوں کے ساتھ ہی یہاں سے چلے کیوں نہیں گئے؟"

اب اس کی معصومیت انارکلی کی اُس تاریخی معصومیت کے مماثل تھی۔ جب اس نے اپنے حُسن کا فائدہ اُٹھا کر اپنے ہاتھ سے شہزادہ سلیم کا بچا ہوا کبوتر بھی اُڑا دیا تھا۔

"آپ لوگوں نے جانے ہی نہیں دیا۔"

"اوہ!" ہمارے مُنہ سے بھی بعینہٖ وہی آواز نکلی جو شہزادہ سلیم کے ہونٹوں سے انارکلی کا جواب سن کر نکلی تھی۔

ہم نے اکثر یہ نوٹ کیا ہے کہ عام بول چال میں ہم بیشتر وہی الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو ہم سے پہلے دنیا کے مختلف بادشاہ استعمال کر چکے ہیں، نہ جانے یہ کیسا شگون ہے لیکن ہم کم از کم یہ امید کرتے ہیں کہ کوئی بُرا شگون نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے اپنے ہوش سنبھالے اور پھر ہم نے سر ہلاتے ہوئے بزرگانہ لہجہ میں کہا۔

"اچھا اب تو تم بھی ہندوستانی تہوار بن چکے ہو گے۔"

"جی ، سو فیصدی"۔

اور پھر قدرے تامّل کے ساتھ اُس نے کہا۔

"جی میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ کو ایسٹر اور بیساکھی نے یاد کیا ہے۔ وہ دوسرے ہال میں کھڑے ہیں۔ ایسٹر کا نام سُنا تو پیسٹریوں اور کیک کے خیال سے ہمارے مُنہ میں پانی آ گیا۔ بیساکھی کے تصوّر سے الھڑ حسیناؤں کے ساتھ بھنگڑہ ناچ کے نظارے آنکھوں کے سامنے تازہ ہو گئے۔ اس خوش خبری کے لیے ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دوسرے ہال کی طرف چل پڑے۔

وہاں پہنچے تو وہ بالکل خالی تھا۔ اگلے ہال میں گئے تو وہ بھی خالی تھا، صرف ایک شخص کھڑا تھا جو شکل سے کافی بے وقوف لگتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر مسکرایا اور بولا "آپ کو بھی اُس مسخرے نے اُلّو بنایا ہے"۔

"کیا مطلب؟" ہم نے قدرے غصّے کے ساتھ پوچھا۔

"جی آپ بھی کیا ایسٹر اور بیساکھی سے ملنے آئے ہیں؟"

ہمیں اعتراف کرنا پڑا کہ ہم اُنہیں کے متلاشی ہیں۔

"آپ بھول گئے کہ ایسٹر کے آنے میں ابھی سات دن اور ہیں اور بیساکھی کو پندرہ دن"۔

"ارے ہاں!"

ہم اپنا سا مُنہ لے کر پہلے ہال کی طرف واپس ہوئے۔ وہاں ہم اپنا غصّہ اُتارنے ہی والے تھے کہ وہ بھولا چہرہ جس نے ہمیں ایسٹر اور بیساکھی سے ملنے کے لیے بھیجا تھا تمسخر کے ماسک میں بدل گیا اور اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

"کہیے جناب کیسی رہی۔ بن گئے نا اپریل کا فول"۔

یہی پہلی اپریل کی خوبی ہے۔ معصوم مذاق۔ کوئی بے ہودگی نہیں، کوئی دل آزاری نہیں کوئی کیچڑ اُچھالنا، کوئی گوبر پوتنا نہیں جیسے جھوٹوں میں سفید ویسے مذاقوں میں سفید مذاق۔ اپریل کا مذاق۔ اس میں کسی مذہب کا تعصب نہیں، کسی علاقہ پرستی کا عنصر نہیں، کسی لسانی تفریق کی جھلک نہیں۔ یہ ایک تہوار ہے جو واقعی بلا لحاظِ مذہب وملت۔ اب سو فیصدی ہندوستانی تہوار بن گیا ہے۔ اسے کشمیر سے کنیا کماری اور پوربندر سے منی پور تک سب ہندوستانی مل جل کر خوشی خوشی مناتے ہیں۔ یہ انسانیت کا تہوار ہے۔

ایسے ہلکے پھلکے مذاق سے انسان جھینپ ضرور جاتا ہے لیکن غصّہ نہیں کرتا ہم جو اپنے آپ کو تیس مار خاں سمجھتے تھے، اپنی بوکھلاہٹ پر آپ ہنس پڑے۔ ہم نے بڑھ کر اُس سے ہاتھ ملایا۔ اُس نے ہمیں گلے سے لگا کر وداع لی۔

"ابھی مجھے اور بہت سے لوگوں کو اُلّو بنانا ہے!"

ہم نے ایک بار اپنی طالب علمی کے زمانہ میں سارے کالج کو اپریل فول بنایا تھا۔ ہم کالج کی کلچرل سوسائٹی کے سکریٹری تھے۔ اس کی طرف سے ہم نے اعلان کیا کہ ۲۵۔ مارچ کو ابی سینیا کا سفیر ایک لیکچر کے لیے کالج آئے گا۔ اُس چھوٹے سے شہر کے کالج کے لیے ایک سفیر کی آمد ایک بہت بڑی بات تھی۔ مقررہ تاریخ سے تین دن پہلے ایک اور اعلان کر دیا گیا کہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر جلسہ ایک ہفتہ کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اب پورے ایک ہفتہ بعد یعنی یکم اپریل کو منعقد ہوگا۔ ہم نے پرنسپل سے خواہش کی کہ وہ جلسہ کے صدر ہوں۔ اُس زمانہ میں ابھی مہمان خصوصی نام کی کوئی جائداد نہیں نکالی گئی تھی۔ شہر کے کئی معززین نے بھی جلسہ میں آنے کی خواہش کا اظہار کیا اور ہم نے چند دعوت نامے خاص طور پر چھپوا کر اُن

کو بھجوا دیئے۔ اُس دن کے اخبار میں "آج کے پروگرام" کے کالم میں اس جلسہ کے انعقاد کی خبر بھی دی گئی۔ شام کو ہم نے ایر فورس کے دو افسروں کو موٹر سائیکل پر لانے کا انتظام کر لیا تھا۔ جب وہ پہنچے تو مائک پر اعلان کیا گیا کہ سفیر کے ایسکورٹ افسر آ گئے ہیں اور سفیر بھی آ ہی رہے ہیں۔ سفیر کے لیے ہم نے ایک دولت مند طالب علم سے کار بھی مانگ لی تھی جو اُس نے بخوشی اس شرط پر دی تھی کہ اُسے بطور خاص سفیر سے متعارف کروایا جائے گا۔ اُس نے اس موقع کے لئے ایک فوٹوگرافر کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ سفیر کے رول کے لیے ہم نے ایک لمبا تڑنگا طالب علم چُنا اور اُسے حبشی بنانے کے لیے اُس کے چہرے بازوؤں اور ہاتھوں پر سیاہی مل دی۔ اُسے ایک پرانا چوغا بھی پہنا دیا اس بھیس بدلی کے بعد وہ پکّا حبشی بن گیا۔ جب ہمارا "سفیر" آیا تو پرنسپل نے اُس کا استقبال کیا۔ ہم نے جلسہ میں تعارف کروایا اور اس نے ایک مزاحیہ قسم کی تقریر کی جس کے دوران کئی بار تالیاں بھی بجائی گئیں۔ آخر میں اُس نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اُلّو بننا گوارا کیا۔

اب حقیقت آشکار ہوئی۔ خوب تالیاں بجیں۔ معززین بہت جھینپے

ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ ایک مرحلہ پر ہمارے پرنسپل کو پتہ لگ گیا تھا کہ یہ اپریل فول کا تماشہ ہے لیکن انھوں نے نہ تو کسی اور کو بتایا اور نہ ہمیں پتہ چل سکا کہ پرنسپل اس مذاق سے واقف ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ہماری حوصلہ افزائی کے لیے آخر تک ہمارا ساتھ دیا۔ یہ تب پتہ چلا جب انھوں نے اپنی شکریہ کی تقریر میں سفیر سے یہ توقع ظاہر کی کہ وہ آنے والے امتحان کی تیاری کرنا نہیں بھولے گا۔ ہم نے سارے کالج کا مذاق اُڑایا اور پرنسپل نے ہمارا ——

ہمارے ایک آشنا ہیں جو ہمیشہ یکم اپریل کو بے شمار لوگوں کو اُلّو بناتے ہیں

اور پھر اس رات کو وہ ان سب لوگوں کو کھانے پر بُلاتے ہیں۔ ایک بار اُن کے اُلّو بنائے ہوئے لوگوں نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے اُنہیں مزہ چکھانے کا فیصلہ کیا۔ ایسے وقت جبکہ ڈنر پارٹی اپنے جوبن پر تھی وہاں سِول سپلائی محکمہ کے دو انسپکٹر آن دھمکے۔ کہنے لگے یہاں گیسٹ کنٹرول آرڈر کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ لہٰذا آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔ اب وہ میزبان اِدھر اُدھر بھاگ رہا ہے۔ بعض مہمانوں کو باتھ روم میں اور بعض کو کچن میں چھپنے کے لیے کہہ رہا ہے اور پھر بار بار انسپکٹروں سے اپیل کر رہا ہے کہ بھائی آپ اچھی طرح گن کے تو دیکھئے چالیس سے زیادہ آدمی نہیں۔ لیکن وہ ٹس سے مَس نہ ہوئے۔

آخر جب معاملہ طول پکڑنے لگا تو ایک انسپکٹر نے تمام راز افشا کر دیا۔ اور تب ہمارے میزبان کی جان میں جان آئی، اب اس نے مذاق کرنا چھوڑ دیا ہے اور یکم اپریل کو صرف ایک دعوت دیتا ہے۔

یکم اپریل کو لوگ اکثر مدعو کئے جاتے ہیں۔ انھیں خط اور تار ملتے ہیں کہ آپ کا تبادلہ ہو گیا، ترقی ہوئی، شادی کی بات پکّی ہو گئی۔ فون پر اطلاع ملتی ہے کہ بڑے صاحب نے آپ کو چائے پر بُلایا ہے دیرینہ خواہش کی تکمیل کی خبر دی جاتی ہے۔ دراصل ہم سب کے اندر ایک بچہ چھپا رہتا ہے۔ برسوں سے گُھٹا گُھٹا سا بُجھا بُجھا سا رہتا ہے ایک دن کے لیے۔ ایک دن کے چند گھنٹوں کے لیے اس صندوق کا ڈھکن کھول دیا جاتا ہے اور وہ بچّہ اپنے چُلبلے پن سے، اپنی معصوم شرارتوں کے ساتھ باہر نکلتا ہے اور ہماری زندگی کو بدل دیتا ہے۔

یکم اپریل چھیڑ چھاڑ کا دن ہے۔ دل لگی کا دن ہے۔ خوش مذاقی کا دن ہے۔ زندہ دلی کا دن ہے۔ ایک دوسرے کے تئیں، خیر سگالی کا دن ہے۔

سال کے باقی دن ہم محض جیتے ہیں۔ اس دن ہم زندہ ہوتے ہیں۔ زندگی کی بقا کے لیے اس دن سات خون معاف ہوتے ہیں۔ گھٹن کا خون، بوریت کا خون، دل کی آزادی کا خون، سنجیدگی کا خون، سڑیل پن کا خون، مردنی کا خون، نفرت کا خون — یہ دن نہ جانے کب اور کہاں سے آیا ہے لیکن آتے ہی ہماری قومی روایت کا جُز بن گیا ہے۔ افسوس صرف یہی ہے کہ یہ دن سال میں صرف ایک بار ہی آتا ہے۔ اگر سال میں دو یا تین یکم اپریل ہوتے تو ہماری قوم اور بھی زندہ دل ہوتی اور ہماری زندگی خوشتر۔ درحقیقت اپریل کا فول بھی وہی مارچ کا فول ہے۔ صرف اس میں ایک مہینہ اور شریک ہو جاتا ہے مارک ٹوین نے کہا تھا کہ یکم اپریل کا دن اصل میں اس بات کی یاد دہانی کرتا ہے کہ ہم سال کے باقی ۳۶۴ دن بھی وہی ہیں جو بظاہر آج کے دن ہیں۔

■■

اَنڈرا کلیس حُسین

کوئی بھی مصنف جب اپنی کتاب چھپواتا ہے تو اپنا تعارف کسی مشہور و معروف ادیب یا وزیر یا کسی وی آئی پی سے لکھواتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی یہ حسرت ادھوری سی رہ گئی جب اس کی پہلی کتاب "تکلّف برطرف" شایع ہوئی تو اُس کی یہ خواہش تھی کہ کرشن چندر اُس کے "درمیانی آدمی" کے فرائض انجام دیں۔ کرشن چندر تیار بھی ہو گئے لیکن اس غلطی کی پاداش میں اُن کو ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ اس طرح مجتبیٰ ادبی تعارف سے محروم ہی رہا۔ اُس کے بعد مجتبیٰ نے بہت کچھ لکھا اور اب اُسے کسی تعارف کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن حسرت حسرت ہی ہوتی ہے اور اگر اُسے پورا نہ کیا جائے تو اُس کے کئی نقصان دہ نفسیاتی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اب مجتبیٰ ہر ادیب کا تعارف کرواتا پھرتا ہے۔ اُن پر خاکے لکھتا ہے تاکہ جس محرومی کا اُسے تجربہ ہوا وہ اُس سے بچ جائے۔ اور پھر دوست کس لیے ہوتے ہیں؟ اگر وہ کوئی حسرت پوری نہ کر سکیں؟ اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں مجتبیٰ کے قریبی دوست کا مرتبہ چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے "درمیانی آدمی" بن جاؤں۔

مجتبیٰ کا خاکہ اُڑانے کا خیال اکثر میرے دل میں آیا۔ لیکن اس مضمون کی ناقابلِ برداشت تحریک اس وقت ملی جب زندہ دلانِ حیدرآباد کا خط آیا کہ اس سال پھر اپریل میں مجھے اُن کے ادبی اجلاس میں شریک ہونا ہے۔ دعوت نامہ دیکھا۔ وہی پرانے گھسے پٹے نام۔ کوئی نیا لکھنے والا نہیں۔ یہ اردو طنز و مزاح کو کیا ہوگیا؟ نئے لکھنے والے کیوں نہیں اُبھرتے؟ اگر ایک بار اُبھرتے بھی ہیں تو پھر ایسا غوطہ لگاتے ہیں کہ ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ خیر، فہرست میں بقول شاعر

"میرا نام تیرے نام کے ساتھ"

ایسے موقعوں پر مجتبیٰ اکثر مجھے فون کرتا ہے۔ اس بار جو فون کیا تو کہنے لگا:
"میرا جانا تو شاید مشکل ہو۔ ابھی ابھی حیدرآباد سے لوٹا ہوں۔ اتنی جلدی دوبارا جا نہیں پاؤں گا۔ حکومت، اُردو پر کتنی ہی مہربان کیوں نہ ہو۔ کب تک دفتر سے میری غیر حاضری کو معاف کرے گی؟"

بات معقول تھی۔ اس سے مجھے احساس ہوا کہ مجتبیٰ لکھنے کے علاوہ بھی کوئی کام کرتا ہے۔ ویسے یہ [illegible] ایسا شخص صرف سرکاری دفتر میں ہی کام کر سکتا ہے۔ سرکار اردو ادیبوں کے تعلق سے بڑی وسیع القلب واقع ہوئی ہے۔ دیکھئے نا۔ یوسف ناظم، رشید قریشی، خواجہ عبدالغفور، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر اور مجتبیٰ حسین کو اگر سرکاری نوکری نہ ملتی تو وہ اردو ادب کی کیا خاک خدمت کر سکتے! ان کو خاک میں ڈھونڈنا پڑتا کہ کیسی کیسی صورتیں روزی نہ ملنے کی وجہ سے اس میں پنہاں ہو جاتی ہیں۔ پرائیویٹ سیکٹر میں وہ بات کہاں!

اب پچھلے چند سالوں سے فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین اور مجھے۔ تینوں کو محفلوں میں اکٹھے جانے اور مضامین پڑھنے کی عادت اتنی ہوگئی ہے کہ کسی محفل میں کسی

ایک کا اکیلے جانا ممکن ہی نہیں لگتا۔ تینوں میں سے کم از کم دو کا "کورم" ہوتا ہے اور اس "کورم" کے بغیر قومی سطح پر طنز و مزاح کی کوئی محفل منعقد نہیں ہو سکتی۔ ادبی جلسوں میں اکٹھے جاتے جاتے اور پڑھتے پڑھتے اب یہ عالم ہو گیا ہے کہ ہم کو ایک دوسرے کے بیشتر مضامین زبانی یاد ہو گئے ہیں۔ چند ہفتوں کی ہی بات ہے کہ ہماری مزاحیہ تکون امروہہ میں مجموعی طور پر مدعو تھی۔ میں پہلے فکر صاحب کے گھر پہنچا اور اُن کو لے کر ہم مجتبیٰ کے گھر کی طرف چلے۔ راستے میں اچانک فکر صاحب گویا ہوئے:

"او ہو! ذرا واپس چلئے، میں مضمون لانا تو بھول ہی گیا۔"

میں نے کہا "پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ اب واپس نہیں جا سکتے۔ آپ یا تو جیسا عموماً کرتے ہیں، میرا ہی کوئی مضمون پڑھ ڈالئے یا مجھے بتا دیجئے کون سا مضمون سُنانا چاہتے ہیں، میں زبانی سُنا دوں گا۔" نتیجتاً فکر صاحب نے اپنے نام سے میرا ہی لکھا ہوا مضمون وہاں سُنایا۔ بہت داد ملی۔ ہم تینوں بہت خوش ہوئے۔ فکر صاحب ایکٹر کی حیثیت سے، میں پلے بیک کی حیثیت سے اور مجتبیٰ ڈائرکٹر کی حیثیت سے۔

خیر۔ میرے کہنے کا مدعا یہ تھا کہ مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ حیدرآباد کے جلسہ میں جو ہماری دانست میں، ہندوستان بلکہ برصغیر کا سب سے بڑا طنز و مزاح کا فنکشن ہے، وہاں "کورم" نہ ہو۔ میں نے اصرار کیا۔ مجتبیٰ نے روایتی ہُوں ہاں کی۔ اصرار میں ہی خوبی ہے۔ اس کا جواب سطحی حیل و حُجّت میں ملتا ہے۔ پھر میں نے فوراً کہا۔ "دیکھو میں تم پر ایک خاکہ پڑھنا چاہتا تھا۔ اگر نہیں آؤ گے تو پھر کوئی اور مضمون لکھوں گا" یہ سُنتے ہی مجتبیٰ نے جواب دیا۔ اگر یہ وعدہ ہے تو پھر حیدرآباد چلتا ہوں، اُس کے بعد اب مجتبیٰ نے مجھے روز فون کرنا شروع کر دیا۔ کسی نہ کسی بہانے بظاہر میرا حال پوچھتے خیر و عافیت دریافت کرتے "حیدرآباد کب جانا ہے" پروگرام تو پکا ہے۔

کہیں منسوخ تو نہیں ہو جائے گا؟" اور بہت ہی ضمنی طور پر ــــ "وہ خاکے والی بات کا کچھ ہوا؟"

تو صاحبان ۔ دوستو ۔ خواتین و حضرات ۔ عزیزو آج اگر مجتبیٰ حسین یہاں موجود ہے تو اس کے لیے آپ کا پیار اور خلوص اور کشش ذمہ دار نہیں ۔ اس کارنامہ کا سہرا میرے سر ہے ۔ آج میں اپنے آپ کو سرخرو محسوس کر رہا ہوں ۔ مجتبیٰ مجھے کتنی بار کھینچ کے گھر سے باہر لے گیا ۔ آج میں اُسے گھسیٹ کے واپس لایا ہوں ۔ مرحبا اردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار کسی ادیب نے اپنے پرزے اڑنے کا تماشا دیکھنے کے لیے ڈیڑھ ہزار کیلو میٹر کی مسافت طے کی ہے ۔ بے چارہ غالبؔ اکثر دہلی کی گلیوں میں ہی گھومتا رہا لیکن ہر بار "پاور کٹ" کی وجہ سے شو کینسل ہو گیا ۔

مجتبیٰ اور میں پانچ سال ایک ہی محکمہ میں کام کرتے رہے (کم از کم میں تو کام کرتا تھا) پہلے دو سال بقولِ خود وہ مجھے میرا بیٹا سمجھتا رہا ۔ بعد میں کسی نے سمجھایا کہ در اصل میں اُس بیٹے کا باپ ہوں ۔ اُس دوران، میں مجتبیٰ کو اُس کا بھوت سمجھتا رہا ۔ اُس وقت مجھے اردو طنز و مزاح کی طرف گھسیٹنے کی کافی کوشش کی جا رہی تھی اور میں اُسے محض تکلف اور رکھ رکھاؤ پر محمول کر کے گریز کرتا رہا یعنی میں نے خود اپنے آپ کو نہ پہچانا ۔ جب میں نے وہ محکمہ چھوڑا تو ایک سال کے لیے انگلینڈ چلا گیا ۔ میری جدائی کے صدمے سے نظام سابع کا انتقال ہو گیا ۔ کسی جرنلسٹ نے انتقال کے فوراً بعد ان کے کمرے کا آنکھوں دیکھا حال قلمبند کیا جو "سیاست" میں چھپا ۔ اُس میں یہ کہا گیا تھا کہ مرحوم کے کمرے میں جا بجا اَدھ جلی سگریٹوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے اور اُن کے بستر کے بازو والی تپائی پر میری پہلی کتاب "بند کواڑ" کی ایک کاپی موجود تھی ۔ اس مضمون کا تراشہ

مجھے کسی نے انگلینڈ بھیجا حالانکہ خط کی عبارت زیادہ لمبی نہیں تھی پھر بھی پڑھنے
میں کافی مشکل ہوئی۔ ایسا لگتا تھا زبان اُردو یا فارسی ہے لیکن لیپی اُڑیا۔ خط
نویس تھا مجتبیٰ حُسین۔ نام ذہن میں محفوظ ہوگیا۔ "بدخطی" کے لحاظ سے میں نے
سمجھا یہ شخص یا تو بنک کا ملازم ہوگا یا کامیاب ڈاکٹر۔

انگلینڈ سے آنے کے بعد میں دہلی چلا گیا اور چار سال تک وہیں رہا۔ اُس
دوران مجتبیٰ کے کچھ مضامین پڑھے۔ بھوت آہستہ آہستہ انسان بنتا گیا۔ پھر ایک
بار جو حیدرآباد آنا ہوا تو مجتبیٰ نے اپنی پہلی کتاب "تکلف برطرف" کی ایک کاپی
مجھے دی۔ برسوں بعد میں نے اردو کی کسی مفت ملی ہوئی کتاب کو ایک ہی اُڑان
میں یعنی دو گھنٹے میں، ختم کر دیا۔ اور پھر دیکھنے لگا کہ کہیں اور صفحے تو نہیں جو میں نہ
پڑھ پایا ہوں۔ وقت کے گزرنے کا احساس تبھی ہوا جب ہوائی حسینہ نے کمر کس
لینے کو کہا۔ ہوائی حسینہ نے مجھے اپنے میں آپ ہنستے دیکھا تو گھبرا کر پائلٹ کے
پاس گئی۔ اُس نے فوراً اعلان کر دیا کہ جہاز اب نیچے جا رہا ہے اور تمام مسافر اپنی کمر
کی پیٹی باندھ لیں۔ 'تکلف برطرف' کے مطالعے کے بعد مجھے تسلی ہوگئی کہ اگر میں
لکھنا بند بھی کر دوں تو اردو طنز و مزاح زندہ رہ سکتا ہے۔ ایک بوجھ جو میں
خواہ مخواہ اپنے سر پر لیے پھرتا تھا، گویا خود بخود اُتر گیا۔ اب جب بھی کبھی لکھنے
کا خیال آتا ہے تو اپنے آپ سے کہتا ہوں کیا ضرورت ہے تکلیف کرنے یا دینے
کی۔ مجتبیٰ جو لکھ رہا ہے، لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ہمیں عموماً اکٹھے
ہی پڑھنے کے لیے مضمون لکھنے پڑھتے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں موم بتی کو دونوں سروں
سے جلانا۔ اُردو قارئین کفایت شعاری کب سیکھیں گے؟

خیر، اس کے لیے میں مجتبیٰ حسین کو ہی موردِ الزام ٹھہراتا ہوں، وہی جا بجا

جلسے منعقد کرواتا پھرتا — اور اس طرح مجاہدانہ طور پر اُردو کی خدمت میں جُٹا رہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنی خدمات کا ڈھنڈورا نہیں پیٹوانا اور بقول خود یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو ادب نے مجتبیٰ کی زیادہ خدمت کی ہے بلکہ اب دیکھا دیکھی دوسری زبانوں نے بھی مجتبیٰ کی خدمت کرنا شروع کر دی ہے کیونکہ کہتے ہیں بیچاری اردو زبان میں اتنی سکت نہیں کہ بیک وقت اتنے ادیبوں کی خدمت کر سکے۔ خیر زبان ادیب کی خدمت کرتی ہے یا ادیب زبان کی — یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بحث کی جا سکتی ہے لیکن میری رائے میں یہ رشتہ تو ایسا ہے جس کے بارے میں چترا جگجیت سنگھ نے ایک گانے میں کہا ہے ؎

پاس رہنا کسی کا رات کی رات

میزبانی بھی ہے مہمانی بھی

اردو مزاح کے نثریہ مشاعروں کا کامیاب تجربہ حیدر آباد میں زندہ دلانِ نے شروع کیا تو مجتبیٰ نے اسے ہندوستان کے دوسرے شہروں میں پھیلایا۔ فکر تونسوی جب پہلی بار زندہ دلانِ حیدر آباد کی ادبی محفل میں آئے تو وہ بہت حیران ہوئے نثر کے لیے انھوں نے اتنا بڑا مجمع کہیں نہیں دیکھا تھا "نہ "ہور" (لاہور) میں بھی نہیں۔ پھر اسی طرح کے اجتماع پٹنہ میں ہوئے، چنڈی گڑھ میں، لکھنؤ میں، امروہہ میں اور کئی جگہ اور بھی جہاں مجھے جانے کا اتفاق نہیں ہوا اس لیے صرف سُنی سنائی یا چیتلائی بات ہی کہہ سکتا ہوں۔

جب ۱۹۷۴ء میں دہلی کے ایوانِ غالب میں مجھے ایک ریسپشن دی گئی تو اس کے پیچھے بھی مجتبیٰ کا ہاتھ تھا۔ میں نے وہاں دہلی والوں سے کہا تھا کہ آپ نے پنجابیوں کو خواہ مخواہ ایک کامپلیکس میں بتلا کر رکھا ہے کہ ہمارا تلفظ ٹھیک

نہیں ۔ حالانکہ ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ اچھی صحت رکھنے کی وجہ سے ہم دو نقطیہ
ق اور ف کا تلفظ کھنگار نکال کر پھینکنے والے عمل کی آواز کے ساتھ نہیں کرتے
بہرحال وہ کامپلکس حیدرآباد جاکر دور ہو جاتا ہے جہاں اُسی ق کو خ کہہ کر
بولتے ہیں ۔ اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ دہلی والوں کو ٹھیک اور اُن
کے تلفظ کو غلط کرنے کے لیے ایک حیدرآبادی کو دہلی بھیجا جائے ۔ اب مجتبیٰ دہلی
میں بس گیا ہے ۔ نسل ہا نسل سے جاری کامپلکس دور ہو جائیں گے ۔ دہلی
والوں کی اردو دُرست ہو جائے گی اور اُن کا ذوقِ مزاح اتنا بڑھ جائے گا کہ
وہ ایک حرف کے تلفظ جیسی سطحی باتوں کو بھول جائیں گے اور چنانچہ ہوا بھی
ایسا ہی ۔

آج مجتبیٰ کے بچے اپنے ہمسایوں کے ساتھ پنجابی میں بات چیت کرتے
ہیں اور مجتبیٰ خود بھی اپنی روزمرہ کی زبان میں پنجابی کا استعمال کرنے لگا ہے
کسی نے سچ کہا ہے کہ حیدرآبادی باہر جاکر سُدھر جاتے ہیں۔

لیکن دہلی میں رہتے ہوئے اور پنجابی بولتے ہوئے بھی مجتبیٰ "پکا" حیدرآبادی
ہے یعنی وہ مہذب انسان ہے ۔ اُس کا دل انسانی دوستی سے معمور ہے ۔ ایک
"سچے" حیدرآبادی کی طرح لحاظ و مروّت اس کی طبیعت کا خاصّہ ہے ۔ وہ کسی
کو "نا" نہیں کہہ سکتا ۔ کسی کی کوئی ضرورت ہو ۔ کسی کا کوئی کام اَٹکا ہوا ہو ،
مجتبیٰ فوراً مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے ۔ کئی بار میں نے دیکھا ہے کہ وہ ان لوگوں
کے منع کرنے کے باوجود بھی ان کی مدد کیے جاتا ہے ۔ نوکری کے لیے ، پاسپورٹ
کے لیے ، ازدواجی تعلقات کے لیے ، سوشل کام کے لیے ، جلسے منعقد کروانے کے
لیے ۔ کسی بھی قسم کا کام ہو وہ سفارش کرنے کے لیے تیار رہتا ہے ۔ اِدھر کی سفارش

اُدھر، اُدھر کی سفارش اِدھر۔ گویا سفارش کے امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا ہے
بس دُنیا میں خیر سگالی اور مفاہمت پھیلاتا رہتا ہے۔ میں اکثر بہت حیران ہوتا ہوں
کہ وہ مختلف شعبوں میں، محکموں میں اور اتنی سطحوں پہ اتنے بارسوخ لوگوں کو
ایسی بے تکلفی سے کیسے جانتا ہے۔ بے شمار ادیبوں، صنعت کاروں، افسروں،
سیاستدانوں اور وزیروں کو وہ جانتا ہے۔ اگر وہ کسی وزیر کو شخصی طور پہ نہیں
جانتا تو کسی ایسے مرد یا عورت کو جانتا ہے جو اُس کو جانتا یا جانتی ہے اور
جس کی وساطت سے کام ہو سکتا ہے۔ وہ کئی بار بڑے لوگوں کو یاد دہانی کرواتا
ہے کہ وہ تو فلاں صاحب کو جانتے ہیں یا فلاں صاحب اُن سے بخوبی واقف ہیں،
اس لیے سفارش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیئے۔ مجتبیٰ کی جیبیں ایسے خطوط
اور چٹوں سے بھری رہتی ہیں جن میں سفارشیوں اور سفارش الیہ کے نام ہوتے
ہیں۔ اب تو ان خطوط اور چٹھیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ جیبوں میں نہیں
سما سکتے۔ اس لیے وہ اب ایک بریف کیس بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ سُنا ہے کہ دو
چار بار اِسی تعلق سے مجتبیٰ کی اپنی بیگم کے ساتھ غلط فہمی بھی ہو گئی تھی کیونکہ اُس کی
جیب سے چند ایسی "بیچاریوں" کے خطوط نکلے جو اُس نے صرف ان کی سفارش کی
یاد دہانی کے لیئے رکھے ہوئے تھے۔

اب ان کی بیگم کا کہنا ہے کہ مجتبیٰ نے عورتوں کے تعلق سے سفارش کرنا چھوڑ دیا
ہے۔ کئی اور دوستوں کا خیال ہے کہ پالیسی میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی۔ صرف مجتبیٰ
نے اپنا حافظہ تیز کر لیا ہے اور وہ ضرورت مند خواتین کے نام اب زبانی یاد رکھتا ہے۔

اب اُس کی بیگم کا ذکر آیا ہے تو ایک اور بات بھی عرض کر دوں۔ بیوی کے
بارے میں مجتبیٰ کا نقطۂ نظر کلاسیکی ہے۔ جس کے بموجب گھر کی چار دیواری ہی بیوی

کی مناسب جگہ ہے۔ اُس نے دہلی TV پر جب ہم بیویوں پر پروگرام کر رہے تھے
علانیہ کہہ دیا تھا کہ اُس کا اپنی بیوی کے ساتھ واسطہ مہینے میں ایک بار پڑتا ہے
اور اُس شام کو جب وہ تنخواہ لے کر گھر آتا ہے جو بیوی کی جھولی میں ڈال دی جاتی ہے
اس کی باقی ماندہ حرکات و سکنات اور نقل و حمل کا پتہ بیگم کو رسالوں، اخباروں
ریڈیو، ٹی وی اور افواہوں سے ملتا رہتا ہے۔ ویسے مَیں اس تھیوری کو نہیں مانتا،
میرا خیال ہے کہ وہ چوری چھپے مہینے میں ایک بار سے زیادہ اپنی بیوی سے مل لیتا
ہے۔ ایک مہینے میں کم از کم دو بار تو میں نے بھی اُسے اس کے گھر میں ہی پکڑا ہے۔
ویسے یہ آسان کام نہیں کیونکہ وہ علی الصبح گھر واپس آتا ہے اور علی الصبح گھر
سے نکل پڑتا ہے۔" میں اس معاملے میں مجتبیٰ سے رشک کرتا ہوں کیونکہ مجھے تو اپنی
بیوی کو نہ صرف کمائے ہوئے پیسے پیسے کا بلکہ گنوائے ہوئے وقت کے پل پل کا
حساب دینا پڑتا ہے۔ اگر اس سے اس کامیاب پالیسی کا راز پوچھا جائے تو اس
کا جواب فارسی میں دیتا ہے "گربہ کشتن روزِ اوّل"

جن بڑے لوگوں اور وزیروں کو وہ شخصی طور پر جانتا ہے، ان کے
بارے میں اس کا کہنا ہے کہ وہ انہیں اس وقت سے جانتا ہے۔ جب وہ ابھی
ٹمرپتی کی راہ پر گامزن نہیں ہوئے تھے اور وہ اکثر اورینٹ ہوٹل کے آزو بازو اور
کبھی کبھی اُس کے اندر آکر اپنی زندگی کا نصب العین ڈھونڈتے تھے۔ افسوس اب
نہ اورینٹ ہوٹل ہی نہیں رہا۔ ہمارے لیڈر کہاں سے اُبھریں گے؟

مجتبیٰ کا سفارش کرنے کا ریپوٹیشن اتنا پھیل گیا ہے کہ اکثر راہ چلتے لوگ
اس کو پکڑ کر سفارش کے لیے درخواست کر دیتے ہیں۔ ایک دو بار میرے دفتر میں وہ
مجھ سے ملنے آیا تو میرے ہی ماتحتین کی سفارشیں اُس کے توسط سے آنا شروع

ہو گئیں۔ "میری بیوی کبھی مجھ سے کسی کی سفارش نہیں کرتی ۔ ایک شخص کے بارے میں مجھ سے دو چار بار کہا بھی لیکن میں نے اصولاً اُس پر کوئی توجہ نہ دی۔ ایک دن اسی شخص کے بارے میں مجتبیٰ نے بھی سفارش کی اور پھر قدرے تامل کے ساتھ یہ بھی کہا کہ شاید مسز لوتھر نے بھی اُس کے بارے میں ذکر کیا ہوگا۔

میں نے مجتبیٰ کی طرف تاسف بھرے انداز میں یوں دیکھا جیسے جولیس سیزر نے بروٹس کو دیکھا تھا اور وہی کہا جو اس نے کہا تھا "سفارش تو تم راست کر سکتے تھے ۔ مسز لوتھر کی وساطت کی کیا ضرورت تھی؟"

مجتبیٰ ذرا جھینپا اور پھر قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ گویا ہوا "نہیں اصل میں سفارش مجھے نہیں کرنا تھی۔ یہ مسز لوتھر کی ہی سفارش ہے۔ انھوں نے ہی مجھ سے آپ کو کہنے کے لیے کہا تھا۔"

میں سمجھتا ہوں کہ مجتبیٰ سفارش کرنے کے لیے اس لیے نہیں جھجکتا کہ وہ فطرتاً ہر انسان کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس سے کسی کی بے بسی، کسی کا دُکھ نہیں دیکھا جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے چلو کسی غریب کی مدد ہو جائے گی۔ اس سے انسان ثواب کا حق دار بنتا ہے جو ـــ کام کرنے والے کو نہیں بلکہ کام کروانے والے کو ملتا ہے۔

اور مسلمانوں کے ثواب میں تو بہت سی ایسی چیزیں شامل ہیں کہ کافر بھی پھسل جاتے ہیں۔ مدد کر کے وہ مجبور انسانوں کے لئے اس فرش پر جنّت بنانا چاہتا ہے اور فوراً اپنے لیے عرشی جنّت میں ایک برتھ محفوظ کروانا چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جنّت میں بھی مجتبیٰ حوروں کی سفارشیں کرتا پھرے گا نہ جانے کس کس معاملے میں!

میں نے مجتبیٰ کو کبھی کسی شخص یا ادیب کے خلاف بات کرتے نہیں سُنا۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ وہ دوسرے ادیبوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی ذہنیت بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور یہ رویّہ صرف وہی لوگ اپنا سکتے ہیں جنھیں دوسروں سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ طنز و مزاح میں مجتبیٰ کا نام اب اُس مقام پر ہے کہ اس کو کوئی گرا نہیں سکتا، کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ شاید اسی لیے اس میں خوشحالی سے پیدا ہونے والا خیر سگالی کا جذبہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجتبیٰ کا کوئی دشمن نہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسا موقع بن جائے کہ اس کو سنگسار کیے جانے کا حکم ہو جائے تو کوئی شخص پہلا پتھر مارنے کو تیار نہ ہوگا۔ آپ نے تاریخ میں پڑھا ہوگا کہ سلطنت روما کے زمانے میں مجرموں اور عیسائیوں کو ایک اکھاڑے میں ڈال دیا جاتا تھا اور پھر بھوکے شیر اُن پر چھوڑ دیئے جاتے تھے جو اُنہیں آن کی آن میں ختم کر دیتے تھے ہزاروں لوگ یہ تماشے دیکھتے تھے۔ ایک بار ایک عیسائی قیدی کو ایسے اکھاڑے میں ڈالا گیا اور اُس پر ایک شیر چھوڑ دیا گیا۔ وہ بھوکا شیر اُس پر لپکا، ایک لحظے کے لیے رُکا اور پھر اس کو نوالہ بنانے کی بجائے ایک کتّے کی طرح اس کو چاٹنا شروع کر دیا۔ روایت کے مطابق شیر نے بتایا (اس زمانے میں شیر بول سکتے تھے) کہ ایک بار جنگل میں جب شیر اور قیدی دونوں آزاد تھے تو قیدی نے جس کا نام انڈراکلیس تھا، اس کے پنجے میں چبھا ہوا کانٹا نکال کر اس کی تکلیف دُور کی تھی اور اب وہ احسان فراموشی کیسے کر سکتا ہے۔ اگر ویسا ہی تماشہ حیدرآباد

کے نئے میدان اسٹیڈیم میں کبھی ہو تو مجتبیٰ یقیناً زندہ بچ نکلے گا۔

اسی لیے آج میں اُسے انڈر اکلیس حسین کا نام دیتا ہوں۔ سات سال پہلے اُس نے مجھے اور فکر تونسوی کو آپس میں ملایا تھا تو میں نے اُسے ہنری کسنجر کا نام دیا۔ وہ اس لیے کہ ہنری کی طرح مجتبیٰ بھی ایسے لوگوں کو آپس میں ملاتا ہے جن کو بہت پہلے ملنا چاہیئے تھا۔ یہ بات آج بھی سچ ہے لیکن سات سال کے غور و خوص کے بعد اور ہنری کسنجر کا حشر دیکھ کر میں نے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر کے اُس کے لیے "انڈر اکلیس حسین" کا نام زیادہ مناسب سمجھا ہے۔ ویسے بھی مجتبیٰ کو اپنے نام کے معنیٰ معلوم نہیں۔ اکثر لوگ اُس کو مصطفیٰ سے کنفیوز کرتے ہیں۔ ہمارے گھر میں بھی کبھی یہ نہیں پتہ چلتا کہ ہمارے کس دوست کا فون آیا ہے۔ "شگوفہ" کے مدیر کا یا اُس کے مشیر کا۔ ایسے نام کا کیا فائدہ جس کے معنیٰ کا ہی پتہ نہ چل سکے اور جس کا تلفظ ایسا ہو جیسے کوئی شرابی مصطفیٰ کا نام لے رہا ہو۔

مجتبیٰ کے فن اور شخصیت دونوں میں ہم آہنگی ہے۔ وہ فطرتاً مزاح نگار واقع ہوا ہے۔ وہ لفظوں کے ہیر پھیر سے مزاحیہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا، جو لطافت اُس کے مزاج میں ہے وہی اُس کے مزاح میں پائی جاتی ہے زندگی میں اس کا کام صرف دوست بنانا اور ہنسنا ہنسانا ہے، اپنے دوست، دوستوں کے دوست، دشمنوں کے دوست، دوستوں کے دشمن، سب کو دوست بناتا رہتا ہے۔ دوستی کی بنیاد GOOD WILL پر ہوتی ہے۔ اُس کے دل میں دنیا کے لیے جنرل گڈ وِل ہے، وہی گڈ وِل اُس کی ادبی تخلیقوں کا منبع ہے۔ میں اُسے بنیادی طور پر مزاح نگار مانتا ہوں،

اُس کے مزاح میں طنز کا عنصر مقابلتاً کم ہے اس لیے زیادہ موثر ہے۔ اُس کی طرز تحریر کے ساتھ اس کی شخصیت اور آواز میں بھی تاثر ہے، اسی لیے وہ نثر پڑھتے وقت اتنا کامیاب ہوتا ہے جتنا کہ ترنم سے پڑھنے والے چند شاعر۔ اور انھیں کی طرح وہ عورتوں میں خاص طور پر مقبول ہے۔ مجھے اس بات کا شخصی تجربہ ہے کیونکہ کئی بار جب میں نے خواتین کو اُن محفلوں میں مدعو کیا جس میں مجھے مضمون پڑھنا ہوتا ہے تو اُن کا اکثر سوال ہوتا ہے کہ کیا مجتبیٰ بھی آئے گا۔ خود میرے گھر میں دو خواتین ہیں یعنی میری بیوی اور بیٹی اور دونوں مجتبیٰ کو سننے کے لیے میرا مضمون بھی سننا گوارا کرلیتی ہیں۔ میرا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ جتنا کسی کو کم اُردو آتی ہے اُتنا ہی وہ مجتبیٰ کے مضامین پسند کرتی ہے اس لیے مجتبیٰ کے مضامین اب نصاب میں شامل کئے جانے لگے ہیں۔

مجتبیٰ کے مشاہدات جب اس کے قلم سے ہوکر کاغذ پر آتے ہیں تو دیکھی ہوئی چیز، گھڑا ہوا واقعہ، سنی ہوئی بات، ایک نئی سی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ حال ہی میں مجتبیٰ جاپان گیا تھا۔ وہ اس نام کا واحد شخص، دکن کا پہلا ادیب اور اردو کا پہلا مزاح نگار تھا جسے یہ موقع ملا۔ حکومت نے اُسے بھیجا تو کچھ سیکھنے کے لیے تھا لیکن وہ وہاں جاپانیوں کو اردو مزاح سکھا آیا۔ اب اُس نے جاپان کا سفرنامہ لکھنا شروع کیا ہے اس کو رائی کا پہاڑ بنانا تو آتا ہی ہے۔ ایک چھوٹے سے ملک کو اُس نے اتنا بڑا کرکے دکھایا ہے کہ اُس کے سفرنامہ کو پڑھ کر جاپانیوں کو اپنی عظمت کا احساس ہو رہا ہے اب جاپان کے وزیر اعظم ہندوستان آنے والے ہیں۔ ہندوستان کی وزارتِ خارجہ نے مجتبیٰ کے مضامین کا خلاصہ بنوایا ہے اور وزارت کے سب افسروں کو حکم ہوا کہ وہ ان مضامین کا مطالعہ کریں۔ اب دیکھنا ہے کہ ہند جاپان تعلقات پر مجتبیٰ کے سفرنامہ کا کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر مجتبیٰ کا اور اردو طنز و مزاح کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ہم آج دعا کرتے ہیں کہ ایک زندہ باد ہو اور دوسرا پائندہ باد۔

[زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۸۱ء میں پڑھا گیا]

اُردو مزاح نگاری میں اب تک دو اسلوبیاتی دھارے خاص کر سامنے آچکے ہیں۔ ایک جو پطرس اور کنہیالال کپور کی یاد دلاتا ہے۔ یعنی جو خوش طبعی، کھلنڈرے پن اور کھلے ڈلے شگفتہ انداز سے عبارت ہے اور دوسرا جو رشید احمد صدیقی کی یاد دلاتا ہے اور اب مشتاق احمد یوسفی سے منسوب ہے۔ یعنی متانت آمیز مزاح جس میں ادبیت اور شعریت کی چاشنی غالب ہے۔ خوش طبعی اور شگفتگی یہاں تبسم زیر لب کی حیثیت رکھتی ہے۔ نریندر لوتھر کا تعلق پہلی قسم سے ہے ...... ان کی مزاح نگاری روزمرّہ زندگی کے معمولی اور مضحک پہلوؤں کے بے محابا اور کھلے ڈلے بیان پر مبنی ہے۔ اس کا اپنا مزہ اور کیفیت ہے۔ نریندر لوتھر اس منزل پر ہیں جہاں انھوں نے اپنا لہجہ، اپنی آواز اور اپنا انداز پالیا ہے۔ نریندر لوتھر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی بھی اچھے مزاح نگار کی طرح وہ طنز سے صرف اتنا کام لیتے ہیں کہ عام زندگی یا معاشرت کی کجیوں کی طرف اشارہ ہو جائے اور ہنسنے ہنسانے کا سامان بھی فراہم ہوتا جائے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

"نریندر لوتھر کے یہاں خیالات کی بھرمار ہے ...... مگر جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ چھوٹے چھوٹے نپے تلے جملے، زبان نہ ہندی نہ اُردو، بڑی عام فہم بھولی بھالی، کوری مٹی جیسی سوندھی مٹھاس ـــــ نریندر لوتھر نے یہ زبان نہ جانے کہاں سے اٹھائی ہے، مگر ہے بڑی جانی پہچانی، کتابی زبان سے ہٹ کر کچھ گھریلو سی زبان جس میں ایک بھی بوجھل لفظ نہیں۔"

عصمت چغتائی

سلسلۂ مطبوعات زندہ دلانِ حیدرآباد